قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ماہنامہ ——— لاہور

خط و کتابت

ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ)

۲۵/بی۔ گلبرگ نمبر ۲، لاہور ۱۱

پوسٹ کوڈ ——— ۵۴۶۶۰

ٹیلیفون: ۸۷۹۲۴۶

مجلسِ ادارت

مُدیرِ مسئول: محمد لطیف چوہدری

معاون: ثریا عندلیب

ناشر: شیخ عبدالحمید

طابع: خالد منصور نسیم

مطبع: النور پرنٹرز و پبلشرز

۳/۲ فیصل نگر۔ ملتان روڈ۔ لاہور ۲۵

ٹیلیفون ——— ۲۷۵۸۲۶

مقامِ اشاعت: ۲۵/بی۔ گلبرگ نمبر ۲، لاہور ۱۱

جلد ۴۳ ——— نومبر ۱۹۹۰ء ——— شمارہ 11

بدلِ اشتراک

سالانہ

پاکستان ——— ۶۰ روپے

بیرونی ممالک ——— (بذریعہ سمندری ڈاک) ۱۲۵ روپے

فی پرچہ: -/۵ روپے

فہرست مضامین

۱	لمعات	ادارہ	۲
۲	پیامِ اقبالؒ	علامہ غلام احمد پرویزؒ	۴
۳	اللہ کے دین کے مخالفین	محمد عمر دراز	۹
۴	تغیرِ نفس	اعزاز الدین احمد خان	۱۱
۵	السلام علیکم	ثریا عندلیب	۳۸
۶	رونا چھوڑیئے	ریحانہ فردوس	۴۱
۷	وقت کے اہم ملّی تقاضے	خلیل الرحمٰن چوہدری	۴۷
۸	تذبذب	مدیحہ خان	۶۳
۹	رابطۂ باہمی	ادارہ	۶۵
۱۰	قانونِ وصیت	عبداللہ شانیؔ	۶۶
۱۱	حقائق و عبر	ادارہ	۶۸
۱۲	نقد و نظر	ادارہ	۷۱
۱۳	قرآن بچوں کیلئے	قاسم نوری	۷۲
۱۴	فہرست کُتب		۷۷
۱۵	BOOK REVIEW	ادارہ	۸۰

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

جمہوری تماشا

وفاقی اور صوبائی اسمبلیوں کے لئے انتخابات کے انعقاد کا اعلان ہو چکا ہے۔ انتخابات کے نتائج معلوم ہونے تک پرچہ شائع ہو چکا ہوگا۔

ملک میں جمہوری تماشا البتہ زوروں پر ہے۔ ہندوؤں میں ایک تہوار ہوتا ہے جسے "ہولی" کہتے ہیں۔ اس میں ہر شخص کو اس کی آزادی اور حق ہوتا ہے کہ وہ دوسروں پر راکھ مٹی، دھول، گوبر کوئلہ پھینکے یا رنگ ڈال کر اُن کے چہرے مسخ اور کپڑے شرابور کر دے۔ وہ سارا دن یہی کچھ کرتے اور اودھم مچاتے رہتے ہیں۔ جو کچھ وہ ایک دن کرتے ہیں، جمہوری عمل میں وہ کچھ کئی ماہ جاری رہتا ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ ہولی میں راکھ اور مٹی ہی پھینکی جاتی ہے۔ ایک دوسرے کے خلاف زبان درازی نہیں کی جاتی۔ لیکن انتخابی مہم میں ایک دوسرے کے خلاف جس جس قسم کی الزام تراشیاں طعن و تشنیع اور غلیظ سے غلیظ تر گالیاں برسائی جاتی ہیں۔ مہذب اور شریف انسانوں کی دنیا میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ یہ سب مغرب کے جمہوری نظام کے ثمرات ہیں جسے ہم آیۂ رحمت سمجھ کر سینے سے لگائے پھرتے ہیں۔ اس نظام کا قدمِ اوّل ہی یہ ہوتا ہے کہ یہ قوم کو مختلف پارٹیوں میں بانٹ دیتا ہے جن کا مفاد الگ الگ اور ایک دوسرے کے متخالف ہوتا ہے۔ لہٰذا ہر پارٹی ایک دوسرے کی حریف و رقیب ہوتی ہے اور جمہوری دستور کے مطابق اِن تمام پارٹیوں کو ایک دوسرے کے خلاف نفرت پھیلانے کی اجازت ہوتی ہے۔

یہی کچھ ان دنوں پاکستان کے گلی کوچوں میں ہو رہا ہے۔ اللہ کرے یہ وقت بخیر و خوبی گزر جائے اور ملک میں ایسا طبقہ برسرِ اقتدار آجائے جو مغرب کے جمہوری نظام پر لعنت بھیج کر قرآنی نظام اختیار کرلے جس میں زمامِ اقتدار ان لوگوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے

—— جن کا فریضہ یہ ہوتا ہے کہ وہ:—

۱ اس نظام کو قائم کریں گے جس میں تمام لوگ قوانینِ خداوندی کا اتباع کریں گے۔
۲ تمام افرادِ معاشرہ کے لئے سامانِ نشوونما مہیا کریں گے۔
۳ ایسے قوانین نافذ کریں گے جو قرآن کی رُو سے قابلِ قبول ہوں
۴ ان قوانین و رسوم کو منسوخ کریں گے جنہیں قرآن ناپسند کرتا ہے۔
۵ غرضیکہ ان کے تمام معاملات، اس پروگرام کی تکمیل کے لئے ہونگے جسے خدا نے نوعِ انسان کی فلاح و بہبود کے لئے تجویز کیا ہے۔

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ وَلِلّٰہِ عَاقِبَۃُ الْاُمُوْرِ (۲۲/۴۱)

درسِ قرآن

تبدیلیٔ وقت

- لاھور ـــ ۸½ بجے کی بجائے ۹ بجے صبح
- ملتان ـــ ۹ بجے کی بجائے ۱۰ بجے صبح
- فیصل آباد ـــ ۳½ بجے کی بجائے ۴ بجے شام

آغازِ نو

- فیصل آباد ـــ محمد صدیق اینڈ سنز گلی نمبر ۱۳ ہر سوموار ۴ بجے شام
- کراچی ـــ ۲۲۸۔ شرف آباد۔ رابطہ محترم خالد گل فون ۵۷۲۸۷۱/۵۴۷۳۲۹ جمعہ ۹½ بجے
- ٹورنٹو ـــ 716 THE WEST MALL 1804 ETOBICOKE . PH:(416).626-6781, 661-2827

نذرِ اقبالؒ

از قلم علامہ غلام احمد پرویزؒ

پیامِ اقبالؒ

دوعالم را تواں دیدن بمیناے کہ من دارم
کجا چشمے کہ بیند آں تماشاے کہ من دارم

قرآن آیا اور اس نے ان تمام زنجیروں کو کاٹ کر پھینک دیا جن میں انسانیت جکڑی چلی آ رہی تھی۔ استبداد ملوکیت کی انسانیت کش زنجیریں جو انسان کو حیوان کی سطح سے بلند ہونے ہی نہیں دیتیں۔ افسونِ ہامانیت (برہمنیت، پیشوائیت، ملائیت اور خانقاہیت) کی مرگ آور زنجیریں جو زندگی کا گلا گھونٹ کر رکھ دیتی ہیں اور مکائدِ قارونیت (سرمایہ پرستی) کی خوں آشام زنجیریں جو شجرِ انسانیت کے پتے پتے سے نمِ حیات چوس لیتی ہیں۔ اس نے ان تمام زنجیروں کو کاٹ دیا تاکہ انسانیت آزادی کی فضاے بسیط میں برگ و بار پیدا کرے۔ کَشَجَرَۃٍ طَیِّبَۃٍ اَصْلُھَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُھَا فِی السَّمَآءِ۔ اس شجرِ مقدس کی طرح جس کی جڑیں پاتال تک پہنچ چکی ہوں اور اس کی شاخیں بامِ عرش کو چھو رہی ہوں۔ اس طرح کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محتاج نہ رہا اس لئے کوئی انسان کسی دوسرے کا غلام نہ رہا۔ اس نے کسی انسان کو یہ حق نہ دیا کہ وہ دوسرے انسانوں پر حکومت کرے۔ اطاعت و اتباع صرف ان قوانین کا رہ گیا جو انسانوں کو خدا کی طرف سے دیئے گئے تھے۔ یہ قوانین ان غیر متبدل اصولوں پر مشتمل تھے جن کی روشنی میں انسانی زندگی اپنے منتہیٰ تک پہنچ سکتی ہے۔ لہٰذا ان قوانین

تکمیلِ دین

کے بعد کسی اور ضابطہ قوانین کی ضرورت باقی نہ رہی اور اس طرح دین مکمل اور نبوت ختم ہو گئی۔

تکمیلِ دین اور ختمِ نبوت کے بعد انسانی معاشرہ کو اس کی ارتقائی منازل طے کرانے کا طریق یہ متعین کر دیا گیا کہ جس جماعت نے ان اصولوں کی روشنی میں اپنی زندگی کو صحیح راستہ پر ڈال لیا تھا اسے اس ضابطہ قوانین کا وارث بنایا گیا تاکہ وہ اس سلسلہ کو آگے بڑھاتی جائے اور ہر دور کا انسان ان اصولوں کی روشنی میں اپنے اپنے زمانہ کے تقاضوں کا حل خود تلاش کرتا ہوا کاروانِ زندگی کو اس متوازن راستے پر لے جائے جسے صراطِ مستقیم سے تعبیر کیا گیا تھا۔

یہ قافلۂ رشد و سعادت ابھی تھوڑی دور جانے پایا تھا کہ ملوکیت کے رہزنوں نے اپنی کمین گاہوں سے سر نکالا اور اس قافلہ کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ ملوکیت بے ساز و یراق کبھی کامیاب نہیں ہوا کرتی۔ وہ اپنی تائید میں پیشوائیت (PRIESTHOOD) اور غاصبانہ سفاد پرستی (CAPITALISM) کو اپنے ساتھ لاتی ہے۔ دنیا کا کوئی فرعون، ہامان اور قارون کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ ان غاصبانہ قوتوں کے راستہ میں قرآن ہی سب سے بڑی روک تھی۔ اس لئے انہیں اپنی کامیابی کے لئے اس سنگِ راہ کو سامنے سے ہٹانا ضروری تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لئے کیا کچھ کیا گیا تفصیل اس کی طویل ہے اور غور سے دیکھئے تو مسلمانوں کی ساری تاریخ گویا اسی اجمال کی تفصیل ہے۔ غیر قرآنی تصوراتِ زندگی کے لئے ایک جامع اصطلاح "عجمی تصورات" ہے۔ ہماری تاریخ تفصیل ہے اس کوششِ مذموم و سعیِ مشوم کی کہ قرآن کی جگہ کس طرح عجمی تصورات کو مسلمانوں کے دل و دماغ پر مستولی کر دیا جائے۔

عجمی تصورات

یہ کوشش بڑی کامیاب رہی۔ ایسی کامیاب کہ اس ایک ہزار سال کے عرصہ میں قرآنی تصورات سے بدل گیا۔ اور بایں انداز کہ یہ عجمی تصورات عین اسلام قرار پا گئے اور قرآنی تعلیم یکسر غیر اسلامی بن گئی۔ چنانچہ آج کیفیت یہ ہے کہ اگر کسی کے سامنے قرآن لایا جائے تو وہ سمجھتا ہے کہ اسے کفر و بے دینی کی تعلیم دی جا رہی ہے اور وہ اس سے اس طرح بھاگتا ہے۔ کانھم حمر مستنفرۃ فرت من قسورۃ۔

ہزار برس سے مسلمانوں پر یہی حالت چلی آ رہی تھی۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس دوران

میں اصلاحِ حال کی کوششیں بھی ہوتیں۔ بہت سی سعید روحوں نے قوم کی زبوں حالی پر خون کے آنسو بہائے۔ اور اس کے دکھ کی دوا ڈھونڈھنے میں بڑی سعی و کاوش سے کام لیا لیکن یہ کوششیں علاماتِ مرض کے ازالہ سے آگے بڑھ کر علتِ مرض تک نہ پہنچ سکیں اور مرورِ زمانہ سے مرض ایسا مزمن اور مریض ایسا سقیم ناتواں ہوتا گیا کہ غیر تو غیر خود اپنے بھی اس کی زندگی سے مایوس ہونے لگ گئے۔ اسلام کے مستقبل کے متعلق یہی مایوسی تھی جو ایران میں باب اور بہاء اللہ کی شریعتِ جدیدہ، اور پنجاب میں نبوتِ فرنگ آفریدہ کی صورت میں نمودار ہوئی اور جس نے تہذیبِ مغرب سے مرعوب اور شکست خوردہ ذہنیتوں کو عام طور پر اپیل کیا مذہب پرست طبقہ نے ان جدید نبوتوں کی تو مخالفت کی لیکن اسلام کے مستقبل سے مایوسی کا غیر شعوری اثر انہیں قومیت پرستی (NATIONALISM) کے آغوش میں لے گیا۔ چنانچہ ابوالکلام آزاد، حسین احمد مدنی و رفقاء ہم اس حقیقت کی زندہ مثالیں ہیں۔

مسلمان عالمگیر مایوسیوں کے اس خوفناک سیلاب میں بہ ہی چلا تھا کہ مبدأ فیض کی کرم گستری نے ان میں ایک ایسا دیدہ ور پیدا کر دیا جس کی نگہ دور رس ہزار برس کے عجمی تصورات کے دبیز پردوں کو چیرتی ہوئی اس مقام تک جا پہنچی جہاں قرآن اپنی اصلی شکل میں دنیا کے پاس آیا تھا۔ وہاں سے اس نے نورِ بصیرت حاصل کیا اور روشنی کی اس کرن نے مایوسی کی ظلمت انگیز طغیانیوں میں امیدوں کی ایک نئی لہر دوڑا دی۔ اس نے تالبِ گور پہنچے ہوئے مسلمان کو پھر سے تھاما اور ایمان و ایقان کی بے پناہ قوتوں کے ساتھ اس حقیقت کو اس کے سامنے واشگاف کیا کہ جس چیز کے مستقبل سے تجھے مایوسی ہو رہی ہے وہ اسلام نہیں عجم کے وہ تصورات ہیں جنھوں نے اسلام کا نقاب اوڑھ رکھا ہے۔ اسلام قرآن کے اندر ہے اور قرآن اس خدا کا پیغام ابدی ہے جو ہمیشہ زندہ ہے اور جس پر موت تو ایک طرف نیند اور اونگھ تک طاری نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا قرآنی ممکنات سے مایوسی، زندگی کے حقائق سے چشم پوشی ہے۔ وہ تیس چالیس برس تک مسلسل و متواتر اس پیغام کو دہراتا رہا۔ اس پیغام کے انداز مختلف تھے۔ لیکن لَم ایک ہی تھی اور وہ لَم یہ تھی کہ اس ہزار سالہ عجمی اثرات کو پھٹک کر الگ کر دو اور قرآن کو اپنی نگاہ سے دیکھو بات واضح ہو جائے گی قرآن کو اس طرح سمجھو گویا وہ خود تم پر نازل ہو رہا ہے۔ اگر تم نے قرآن کو اس طرح سمجھ لیا تو یہ تمہارے شعور میں انقلاب پیدا کر دیگا۔ اور انقلابِ شعور سے خارجی دنیا میں خود بخود انقلاب آ

نگہ بصیرت

جلتا ہے۔

کہ یہی ہے امتوں کے مرضِ کہن کا چارہ

اقبال یہ پیغام دے کر چلا گیا لیکن جو کچھ قرآن کے پیامبر اولینؐ کے ساتھ ہوا تھا وہی کچھ اس کے ساتھ ہوتا نظر آرہا ہے۔ قرآن زندگی کا پیغام تھا اس لئے اس نے بار بار اس کا اعلان ضروری سمجھا کہ یہ شاعری نہیں، شاعری ایک پیامبر کے شایانِ شان ہی نہیں ہوتی لیکن مسلمانوں نے ان تنبیہات کے باوجود قرآن سے ایسی شاعری کی کہ اسے چیستان بنا کر رکھ دیا۔ مذہب کو شاعری کی فضا خوب راس آتی ہے حقیقت یہ ہے کہ مذہب کا بیج پھوٹتا ہی شاعری کی زمین سے ہے۔ اور اس کی پرورش بھی شاعری کی فضا میں ہوتی ہے۔ دین کا مدار حقائق پر ہوتا ہے، مذہب کا انحصار الفاظ پر۔ دین زندگی کا ضابطہ دیتا ہے، مذہب چند موہوم تصورات پیش کرتا ہے۔ دین کے مسلمات کی پرکھ محسوس نتائج سے ہوتی ہے مذہب ذہنی اطمینان کا فریب دیتا ہے۔ یہی کچھ شاعری کرتی ہے۔ الفاظ کا الٹ پھیر، فنی قیود و شرائط کا شدت سے التزام، اور ان سب کا نتیجہ کچھ وقت کی واہ واہ۔ اقبال نے قرآن کا پیغام دیا اسلئے

شاعری

قرآن ہی کے اتباع میں وہ عمر بھر اعلان کرتا رہا کہ میرا پیغام شاعری نہیں، نہ شاعری میرے شایانِ شان ہے۔ لیکن قوم ہے کہ اس کی ان تمام تنبیہات کے باوجود اسے شاعر بنانے پر مُصر ہے۔ گانے والے اور گانے والیوں کی زبان پر کبھی داغ اور غالب کی غزلیں ہوا کرتی تھیں۔ اب اُن کی جگہ اقبالؒ کے شعروں نے لے لی ہے۔ قوالی کہ جس کے زور پر تصوف زندہ رہتا ہے، اس کے سوا کیا ہے کہ عقل و بصیرت کو ماؤف کر کے انسان کے سطحی جذبات میں ہیجان پیدا کیا جائے۔ اقبال نے اسی لئے اسے افیون سے تعبیر کیا تھا۔ آج وہی قوالی اقبال کی سب سے بڑی نقیب ہے۔ جو ملک خود اقبال کے قرآنی تصور کا عطیہ ہے اس میں اگر کسی چیز سے بُعدِ اجنبیت، بلکہ بغض و عناد ہے تو اقبال کے قرآنی پیغام سے۔ مذہب اور مفاد پرستی کا رشتہ پھر سے استوار ہو رہا ہے۔ وطنیت کی لعنت ذاتوں، برادریوں اور خاندانوں سے آگے گزر کر صوبجاتی تفریق کی محکم گیر صورت اختیار کر چکی ہے۔

حالات ہر چند نامساعد و ناموافق ہیں لیکن اس کے باوجود مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔ وہ قرآن جسے اقبال کا پیغام ہمارے سامنے دوبارہ لایا، زندہ اور پائندہ ہے۔ دنیائے انسانیت کا مستقبل

صرف قرآن سے وابستہ ہے جن لوگوں کے دل میں یہ حقیقت اقبال کی طرح ایمان بن کر سما گئی ہے

اُمید کی کرن

ان پر لازم آتا ہے کہ وہ بھی اقبال کی طرح اس پیغام کے عام کرنے میں اپنی پوری عمر بسر کر دیں مردہ پرست قوم زندہ انسانوں کی باتوں کو نہیں سنا کرتی۔ وہ زندہ افراد کا گلا گھونٹ کر انہیں مار دیتی ہے اور پھر ان کی قبروں پر اپنی ہوسِ مردہ پرستی کی تسکین کے بڑے بڑے عظیم القدر مقبرے تعمیر کیا کرتی ہے لیکن جس طرح ان تمام نامساعد حالات کے باوجود اقبال نے اپنے پیغام کے عام کرنے میں کبھی ہمت نہ ہاری اسی طرح اس پیغام کی نشر و اشاعت میں ان لوگوں کو بھی عزم و ثبات سے کام لینا ہوگا۔ قرآن کو انسانیت کا نصب العین بن کر رہنا ہے۔ اس کے سوا زندگی کے مسائل کا کوئی اور حل نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ شرف کس قوم کے حصہ میں آتا ہے کہ وہ اس شمعِ ہدایت کی علمبردار بن کر انسانیت کے بھٹکے ہوئے قافلہ کو صحیح راستہ پر لے چلے۔

("اقبال اور قرآن" سے ماخوذ) سنہ ۱۹۵۰ء

نورِ مبین

خُدا نے اپنی کتاب قرآن مجید کو نُور کہا ہے۔ نُور روشنی ہے اور روشنی اپنے آپ کو دکھانے کے لئے کسی اور کی محتاج نہیں ہوتی۔ وہ فی ذاتہٖ روشن ہوتی ہے اور دوسروں کو روشنی عطا کرتی ہے۔ اس لئے قرآن کریم اپنے معانی واضح کرنے کے لئے کسی خارجی سہارے کا محتاج نہیں۔ یہی بات:

- سر سیّد نے کہی ——— نیچری کہلایا
- علامہ اسلم جیراجپوری نے کہی ——— کافر کہلایا
- علامہ غلام احمد پرویز نے کہی ——— منکرِ حدیث ٹھہرا

کاش ان فتویٰ گروں نے تھوڑا سا علم طبیعیات کا بھی پڑھ لیا ہوتا جس کا مسلّمہ اصول یہ ہے کہ روشنی ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ کی رفتار سے بلا واسطہ سفر کرتی ہے اور یہ وہ حقیقت ہے جسے آج کا ہر طالب علم سمجھتا ہے۔ ——— طالب علم ۔ مرزا آصف بیگ ———

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محمد عمر دراز

اللہ کے دین کے مخالفین

قرآن کریم نے پیغامِ رسالت مآبؐ کو انسانوں تک پہنچنے سے روکنے کے لئے مخالفین کے جن حربوں کا ذکر کیا ہے ان میں سرِفہرست یہ بتایا ہے کہ:-

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ (۴۱ : ۲۶)

جو لوگ قانونِ خداوندی سے انکار اور سرکشی برتتے ہیں، وہ اپنے لوگوں کو تاکید کرتے رہتے ہیں کہ دیکھنا! تم کہیں قرآن کو نہ سُن لینا (اس سے تمہارے عقائد خراب ہو جائیں گے) بلکہ جہاں دیکھو کہ کوئی شخص قرآن کی بات کرتا ہے، وہاں شور مچا دو۔ کائیں کائیں کرنے لگ جاؤ۔ اس طرح کچھ امید ہو سکتی ہے کہ تم ان پر غالب آسکو۔ (ورنہ یہ ناممکن ہے کہ لوگ قرآن کی باتیں سنیں اور متأثر نہ ہوں)" مفہوم القرآن۔

جب قرآن کا پیغام، بہرحال انسانوں تک پہنچتا ہے۔ (کیونکہ یہ اللہ کا پروگرام ہے کہ آخرالامر انسانیت نے اس کے مطابق ایک برادری بن کے رہنا ہے اور اس نظام کو اپنانا ہے، چاہے اللہ کے عطا فرمودہ نظام کے ساتھ انسانی دساتیر و اصول ملانے والوں (مشرکین) کو یہ بات کتنی ہی ناگوار کیوں نہ گزرے (۴۸ : ۲۸) تو مخالفین مفاہمت کا لبادہ اوڑھ کر اسے روکنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی پہچان کے لئے قرآن کریم نے جتنی مکمل اور واضح انداز میں ان کی تصویر کشی کی ہے۔ اُس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کس قسم کے مزید حربوں پر اُتر آتے ہیں۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ارشادِ ربانی ہے:-

فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ ۝ وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ۔ (۶۸ : ۸ : ۹)

یہ لوگ ان حربوں پر اس لئے اتر آتے ہیں کہ یہ چاہتے ہیں کہ تو اس قسم کے طعن و تشنیع سے تنگ آکر مفاہمت پر آمادہ ہو جائے۔ یعنی کچھ تو اپنے مقام سے ہٹے، کچھ یہ نرم پڑیں اور اس طرح

تم دونوں میں مفاہمت کی شکل پیدا ہو جائے۔ لیکن تم ان کی بات بالکل نہ ماننا۔ (اس لئے کہ جو شخص حق پر ہو اس کے لئے اپنے مقام سے ذرا ہٹ جانا بھی اس کی شکست ہے۔ حق اپنے مقام سے ہٹا تو باطل ہو گیا۔ اس کے برعکس، باطل کوئی بھی مقام اختیار کرلے، اس کا کچھ نہیں بگڑتا۔ وہ پہلے بھی باطل تھا، پھر بھی باطل رہے گا۔ صحیح جواب ایک، اور صرف ایک ہوتا ہے غلط سینکڑوں ہو سکتے ہیں)" (۱۰:۱۵، ۱۳ : ۱۱، ۷۴ : ۱۷) (مفہوم القرآن)

وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِينٍ ۝ (۶۸ : ۱۰)

" (اے رسول) جماعتِ مخالفین کے اس نمائندہ کی (جو مفاہمت کی پیش کش لے کر آیا ہے) یہ حالت ہے کہ یہ بڑا دنی الطبع، پست ذہنیت کا مالک اور سخت جھوٹا ہے۔ اسی لئے اپنی بات کو سچا کرنے کے لئے قسموں پر قسمیں کھائے چلا جاتا ہے" (مفہوم القرآن)

هَمَّازٍ مَّشَّآءٍۭ بِنَمِيمٍ ۝ (۶۸/۱۱)

" یہ چاہتا ہے کہ اپنی دسیسہ کاریوں اور وسوسہ انگیزیوں سے تمہاری جماعت میں تفرقہ پیدا کردے۔ اس کی نگاہ کا زاویہ اس قدر بگڑ چکا ہے کہ اسے کہیں بھی حسن اور خیر نظر نہیں آتا۔ ہر جگہ شر نقص اور خرابی دکھائی دیتی ہے۔ ہر وقت لگائی بجھائی میں مصروف رہتا ہے۔ اِدھر کی بات اُدھر اور اُدھر کی بات اِدھر کرتا پھرتا ہے اور اپنی باتوں میں جھوٹ اور سچ ملا کر، ہر جگہ فساد پیدا کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے"۔ (مفہوم القرآن)

عُتُلٍّۭ بَعْدَ ذَٰلِكَ زَنِيمٍ (۶۸:۱۱)

"شقی القلب، بے درد، سخت گیر، جھگڑالو، ہر وقت نیت یہ کہ لوگوں کا سب کچھ سمیٹ کر ہڑپ کر جاتے یہ زندگی کی سرسبزی اور شادابی سے یکسر محروم ہے، اس لئے بڑا ہی ذلیل اور کمینہ ہے" (مفہوم القرآن)

اللہ کے پیغام کو دوسرے انسانوں تک پہنچانے والوں کو اس قسم کی سیرت و کردار کے عناصر سے خبردار بھی رہنا چاہئے اور ان کی دسیسہ کاریوں اور وسوسہ انگیزیوں کا سدِّباب بھی کرنا چاہیئے۔ کیونکہ اگر ایسا نہ کیا جائے تو (گو اس نظام کا نفاذ رک تو نہیں سکتا لیکن) اس نظام کے قیام میں تاخیر ہو گی اور انسانیت باطل نظام کے شکنجوں میں جکڑی ظالم اور جابر انسانوں کے استبداد میں کچھ دیر اور تڑپتی رہے گی۔ اور طلوعِ سحر کچھ دیر اور رکی رہے گی۔

برگیڈیئر ریٹائرڈ اعزاز الدّین احمد خان

تغیرِ نفس کے بغیر ــــــ تغیرِ احوال ممکن نہیں!!(۱۳/۱۱)

یہ (مقالہ) انگریزی مضمون "ALLAH'S LAW OF CHANGING CONDITION OF A PEOPLE" کا آزاد ترجمہ ہے، جسے مصنف نے "ہولی قرآن ریسرچ فاونڈیشن" اسلام آباد کے سیمینار میں پڑھنے کیلئے تحریر کیا ہے۔
ایڈیٹر

تمہید قرآنِ حکیم میں قوموں کے عروج و زوال کے متعلق اہم اصول یہ بیان کیا گیا ہے کہ:

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِھِمْ (۱۳/۱۱)

اس کے معنی یہ ہیں کہ جب تک کوئی قوم خود اپنی نفسیاتی کیفیت نہیں بدلتی اس کی حالت میں تبدیلی نہیں آتی۔ لیکن اس میں ایک باریک پہلو ہے۔ عرب اونٹوں پر سفر کرتے تھے۔ انہی پر اپنا مال وغیرہ لادتے تھے۔ اونٹ پر کجاوہ باندھا ہو یا مال لدا ہو۔ چلتے چلتے وہ ضرور ڈھیلا پڑ جاتا ہے۔ کبھی کبھی ان چیزوں کو یا ان کی رسیوں کو مرمت کی بھی ضرورت پڑ جاتی ہے۔ چنانچہ وہ لوگ چلتے چلتے اس بات کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھتے کہ کونسی رسّی ڈھیلی ہوگئی ہے، کونسا کجاوہ اپنی حالت پر نہیں رہا۔ جہاں ضرورت سمجھتے فوراً اونٹ کو بٹھاتے اور اس کا کجاوہ یا بوجھ درست کر دیتے۔ اسے وہ کہتے: غَیَّرَ عَنْ بَعِیْرِہٖ۔ اس نے اونٹ پر سے کجاوہ اتارا اور اسے درست کرا کے پھر باندھ دیا۔ یا تَرَکَ الْقَوْمَ یُغَیِّرُوْنَ۔ اس نے لوگوں کو اس حالت میں چھوڑا کہ وہ اپنے اونٹوں کے کجاووں (سامانِ سفر) کی دیکھ بھال کر رہے تھے تاکہ ہر چیز کو ٹھیک ٹھاک کر کے چلیں۔

قوموں کی زندگی میں بھی یہی حالت ہے۔ جو قوم اپنے سفرِ زندگی میں اپنے ساز و سامان پر نگاہ رکھتی ہے اور ساتھ کے ساتھ اس کی مناسب مرمّت (ADJUSTMENT) کرتی جاتی ہے وہ حسن و خوبی سے منزلِ مقصود تک پہنچ جاتی ہے۔ لیکن جو اس سے غافل ہو جاتی ہے "اس کے اونٹ کا بوجھ راستے میں گر پڑتا ہے" ایسا لگتا ہے جیسے ہماری قوم کے "اونٹ" کی بات ہو رہی ہو۔

یہ ملّتِ پاکستان کی انتہائی بدنصیبی ہے کہ قائدِ اعظمؒ کے بعد اسے ایسا میرِ کارواں نہ مل سکا

جو ملّت کے کارواں کی راہنمائی اس کی اصلی منزل کی طرف کرتا۔ نتیجہ اس کا یہ ہُوا کہ "ہمارے "اونٹ کا بوجھ" راستے میں ایسا گرا کہ بکھر کر رہ گیا۔ کاروانِ ملّت اپنے راستے سے بھٹک گیا اور بھٹکتا چلا گیا۔ جو منزل دو چار ہاتھ آگے تھی نزدیک ہونے کے باوجود، دُور تھی اور دُور ہوتی چلی گئی۔ ہم ان نظریات کو ہی بھول گئے جن کی بنیادوں پر اس مملکت کا قیام عمل میں آیا تھا۔ ہمارے ہاں ساری تباہیوں اور قیامت خیزیوں کا اصل سبب ہی یہ ہے کہ یہاں بنیادوں کی طرف کسی نے توجہ نہیں دی۔ یہی نہیں کہ ان کی طرف کوئی توجہ نہیں دی گئی بلکہ انہیں کھوکھلا کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی گئی۔

ہمارے اربابِ سیاست، عمایدینِ مذہب، ارکانِ نظم و نسق کی کامل بیالیس سال سے یہ روش چلی آرہی ہے کہ انہوں نے اسلام کو ایک تعویذ سمجھ رکھا ہے جسے وہ اپنی اپنی دکانوں کے دروازوں پر لٹکا کر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ اب جنّات اور شیاطین کا کوئی خطرہ نہیں رہا۔ نظریۂ پاکستان کے الفاظ اٹھتے بیٹھتے دہرائے جاتے ہیں، لیکن کسی نے آج تک متعیّن طور پر نہیں بتایا کہ یہ نظریہ ہے کیا۔ دو قومی نظریہ جو اسلام کی ایک بنیادی حقیقت ہے (۶۴/۲) اور جو مطالبۂ پاکستان کی مستحکم دلیل تھی اسے اب قائدِ اعظمؒ کا ایک وکیلانہ حربہ قرار دے کر اس کا مذاق اڑایا جا رہا ہے۔

ہماری اِن تغافل شعاریوں کا نتیجہ یہ ہُوا کہ قوم کا اپنے نظریاتِ حیات پر سے یقین ہی اُٹھ گیا، اور ہمارا معاشرہ بے یقینی کا شکار ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ جو معاشرہ اس طرح بے یقینی کے جذام میں مبتلا ہو جائے اس سے صحت مندانہ اقدام کی توقع کس طرح کی جا سکتی ہے۔ اس لئے کہ:

یقیں افراد کا سرمایۂ تعمیرِ ملّت ہے!

ہمارے معاشرہ کی حالت آج یہی ہو چکی ہے کہ:

سینہ تمام داغ داغ پنبہ کُجا کُجا نہم!

اسلام کے نام پر حاصل کئے جانیوالا یہ خطۂ ارضی، جس اضطراب و خلفشار سے اب گزر رہا ہے۔ یاس و نا امیدی کی جو گھٹا اس کی فضا کو اس وقت محیط ہے، عدم سکون اور فقدانِ اطمینان کا جو کرب انگیز عالم اس وقت ہے، قانون شکنی اور جرائم کیشی جس حد تک اب عام ہو رہی ہے، حال جس قدر تاریک اور مستقبل جس قدر تاریک تر نظر آرہا ہے، پہلے کبھی ایسا نہیں ہُوا تھا۔ اب اُن قیامت خیزیوں، جو "باب الاسلام" کے شہر کراچی، حیدر آباد پر آئے دن گزر رہی ہیں، کے اسباب و علل کی تحقیق کرنے کے لئے کمیٹیاں اور کمیشن مقرر ہوئے ہیں۔ لیکن ہمارے یہ کمیشن اور کمیٹیاں اس قسم کے حوادث کے سطحی اسباب کے گرداب میں الجھ کر رہ جاتی ہیں۔ دریا کی گہرائی میں اتر کر، بنیادی اور اساسی علّت و اصل تک نہیں پہنچتیں۔ اگر اس انداز سے تحقیق کی جائے تو یہ بات بہ آسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ:

تماشا ایک ہی ہے تم اسے جس دور میں دیکھو
وہی بھولی ہوئی منزل، وہی بھٹکے ہوئے راہی!

یہ سب قیامت خیزیاں اس لئے ہیں کہ ہم نے اپنی نئی نسل کی تعلیم و تربیت کا صحیح انتظام نہ کیا۔ نہ ہم نے ان کے سامنے اس نصب العین کے چراغ روشن کئے جس کے لئے اس مملکت کو حاصل کیا گیا تھا۔ نہ ہی ہم نے اُن راستوں کی نشاندہی کی جو انہیں اس منزل تک پہنچا دے۔ اہم نکتہ جو ہمیں ذہن میں رکھنا چاہیئے تھا یہ ہے کہ وطن یا نسل کو بنائے قومیت قرار دینے سے قوم کی تشکیل کے لئے کسی قسم کی جدوجہد کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ہر بچہ پیدائشی طور پر اس قوم کا فرد ہوتا ہے، لیکن کسی نظریہ کی بنا پر قوم کی تشکیل کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ قوم کے بچوں کو اس نظریہ کی تعلیم دی جائے۔ ہم نے تعلیم کے اس اہم مقصد سے اغماض برتا اور آج اس کا نتیجہ بھگت رہے ہیں۔

آئیے دیکھیں کہ قرآن کریم موجودہ یاس انگیز ماحول سے نکلنے کی راہ کیا بتاتا ہے جس میں بعض لوگ غیر جانبداری یا بے اعتنائی (INDIFFERENCE) کے فریبِ نفس میں مبتلا ہو کر جہادِ زندگانی سے منہ موڑ چکے ہیں۔ اور جن کے خون میں حرارت ہے انہوں نے سرکشی اور فساد انگیزی کی تخریبی روش اختیار کر لی ہے۔

تغیرِ نفس کے بغیر تغیرِ احوال ممکن نہیں

جو اربابِ دانش، اصلاحِ معاشرہ کیلئے اپنے ذہن سے تجاویز سوچتے ہیں وہ مختلف نتائج پر پہنچتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ ملک میں رائج قوانین میں بنیادی خرابی ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ یہاں کا سیاسی نظام غلط بنیادوں پر استوار ہے۔ ایک طرف سے آواز آتی ہے کہ اصل خرابی معاشی نظام ہے یہ اور اسی قسم کی اور آوازیں مختلف سمتوں سے آتی ہیں، لیکن قرآن کچھ اور کہتا ہے اور یہ بات چودہ سو سال پہلے کہی گئی تھی جس آیۂ جلیلہ میں یہ بات کہی گئی ہے اسے پڑھا تو اکثر جاتا ہے لیکن جس پر غور بہت کم کیا جاتا ہے۔ وہ ہے سورۃ الرعد کی گیارہویں آیت جس میں کہا گیا ہے کہ :-

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِھِمْ۔ (۱۳/۱۱)

یاد رکھو! کسی قوم کے خارجی حالات میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ قطعاً نہیں ہو سکتی۔ وہ قوم جو جی میں آئے کر دیکھے اس کے احوال و ظروف کبھی نہیں بدل سکتے۔ جب تک وہ قوم اپنے اندر تبدیلی نہ پیدا کرے۔ جب تک اس کے قلب و دماغ میں تبدیلی نہ ہو۔ جب تک اس کی ذہنیت نہ بدلے جب تک اس میں فکری اور ذہنی تبدیلی نہ ہو جب تک اس میں نفسیاتی تبدیلی نہ ہو اس کی حالت نہیں بدل سکتی، اس کی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ یہ خدا کا اٹل قانون ہے جس کے خلاف کبھی کچھ نہیں ہو سکتا۔ ایسا ہونا ناممکن ہے۔ اس کے بعد کہا گیا ہے کہ :-

وَاِذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ سُوْٓءًا فَلَا مَرَدَّ لَهٗ ۚ وَمَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّالٍ (۱۳/۱۱)

اور یہ بھی ایک غیر متبدل قانون ہے کہ جب کسی قوم پر، اس کے اعمال کے نتیجے میں تباہی آتی ہے تو اسے کوئی روک نہیں سکتا۔ اور نہ ہی اس قوم کا کوئی حامی و مددگار ہو سکتا ہے۔ اس اصولِ خداوندی سے ہمیں ڈرنا چاہیئے کہ وہ ہمیں مہلت کے وقفے بار بار نہیں دے گا۔

قرآنِ حکیم نے اس آیۂ جلیلہ (۱۳/۱۱) میں نفسیاتی تغیّر کا ایک بنیادی اصول بیان فرمایا ہے۔ جس کی بنیادوں پر افراد اور اقوام کی زندگی کی ساری عمارت استوار ہوتی ہے اور وہ اٹل اصول یہ ہے کہ تغیّرِ نفس کے بغیر تغیّرِ احوال ممکن نہیں۔ یہی اصول میرا موضوعِ سخن ہے۔ اسی قرآنی اصول میں ہمارے بیمار معاشرہ کا علاج پنہاں ہے۔ لیکن ہمارے ہاں تغیّرِ نفس کے بغیر تغیّرِ احوال کی کوشش کی جا رہی ہے اور (بدقسمتی سے) اسے "احیاءِ اسلام" کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ تغیّرِ نفس کے بغیر تغیّرِ احوال کی کوشش کرنا اور سمجھنا کہ ہمیں اس میں کامیابی ہو جائے گی دراصل اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کو چیلنج دینے کے مترادف ہے۔ (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ)

جو کچھ قرآنِ حکیم نے آیت (۱۳/۱۱) میں کہا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ باقی دنیا کے لئے اس کی حیثیت ایک اصول کی سی ہے۔ ایک نظریہ کی ہے۔ اُن سے کہا گیا ہے اگر تمہیں اس کی صداقت پر یقین نہ ہو تو تم اس کے بجائے کوئی اور طریقہ اختیار کر کے اسے آزما کر دیکھ لو! وہ قطعاً کامیاب نہیں ہوگا وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ص جو اصول تمہارے سامنے پیش کیا جا رہا ہے اگر تمہیں اس کی صداقت پر یقین نہ ہو تو تم اس کی مثل کوئی اور اصول اور نظام اور طریقِ کار اور ضابطہ وضع کر کے دیکھ لو۔ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ... (۲/۲۳) تم اکیلے ہی نہیں اپنے ساتھ دنیا بھر کے اربابِ فکر و دانش کو ملا لو اور سب مل کر اس کی کوشش کر دیکھو تم کبھی کامیاب نہ ہو سکو گے۔

یہ تو غیر مسلموں کے لئے ہے لیکن مسلمان جو قرآن کی صداقت پر ایمان رکھنے کے مدعی ہیں ان کے لئے اس اصول کی حیثیت مختلف ہے۔ اگر وہ سمجھیں کہ تغیّرِ احوال کی صورت یہ نہیں، کوئی اور ہے تو یہ کفر ہوگا۔ اگر وہ سمجھیں کہ یہ بھی ایک تدبیر ہو سکتی ہے لیکن اس کے علاوہ اور بھی تدابیر ہیں تو یہ شرک ہوگا۔ اور اگر اس تدبیرِ خداوندی کو چھوڑ کر دیگر تدابیر پر عمل پیرا ہو جائیں تو یہ گویا خدا کو چیلنج دینا ہوگا کہ تم کہتے ہو کہ تغیّرِ احوال کی ایک ہی صورت ہے، یعنی تغیّرِ نفس، لیکن ہم تغیّرِ نفس کے بغیر اپنے احوال میں تبدیلی کر کے بتا دیں گے (معاذ اللہ) غیر مسلم عقل کے تجرباتی طریق سے مختلف تدابیر کے آزمانے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچ رہے ہیں کہ نظریاتی تبدیلی کے بغیر انقلاب نہیں لایا جا سکتا۔ اور اس اصول کو صحیح ماننے پر مجبور ہو رہے ہیں جسے قرآن نے پیش کیا تھا۔

لیکن ہم یہاں بیالیس سال سے اللہ کے خلاف۔ محاذ قائم کئے ہوئے ہیں کہ ہم نفسیاتی تبدیلی کے بغیر انقلاب لاکر بتادیں گے۔ لہٰذا جو کچھ ہمارے ساتھ ہو رہا ہے وہ اسی کا نتیجہ ہے اور جب تک ہم اپنی موجودہ روش تبدیل کرکے، قرآن کا تجویز کردہ اصول کی طرف نہیں آتے ہمارے حالات میں تبدیلی پیدا نہیں ہوسکتی۔

تغیرِ نفس

سوال یہ ہے کہ جسے تغیرِ نفس کہا جاتا ہے اس کا علمی مفہوم کیا ہے؟ ہمارے ہاں کے شعراء کے ہاں یہ موضوع بڑا مقبول اور محبوب چلا آرہا ہے۔ وہ اسے نفس کے بجائے دِل کہہ کر پکارتے ہیں اور کہتے ہیں کہ:

ے میں اب سمجھا کہ دنیا کچھ نہیں، دنیا مرا دِل ہے
بدل جانے سے اس کے، رنگ ہر اک چیز کا بدلا

ایک اور شاعر نے کہا ہے:۔

ے نہ کلی ہے وجہِ نظر کشی، نہ کنول کے پھول میں تازگی
فقط ایک دِل کی شگفتگی، سببِ نشاطِ بہار ہے

اخترشیرازی کا انداز اپنا (اور بڑا پُرکیف) ہے وہ کہتا ہے کہ:

یہ کس کو دیکھ کر دیکھا ہے میں نے بزمِ ہستی کو
کہ جو شئے ہے نگاہوں میں حسیں معلوم ہوتی ہے

اِن تغیرات کا تعلق جذبات سے ہے۔ اس کے برعکس قرآن کے پیشِ نظر اقدار (VALUES) کا تغیر ہے۔ یعنی قرآنی اقدار کے لئے تغیرِ نفس پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے اقبالؒ اسے تعمیرِ خودی سے تعبیر کرتا ہے، جس کے احاطہ میں جذبات اور اقدار دونوں آجاتے ہیں۔ اس کا سارا فلسفہ اس نقطہ کے گرد گردش کرتا ہے۔ وہ اشیائے کائنات کی قدر و قیمت کا پیمانہ خود انسان کو قرار دیتا ہے۔ اس لئے وہ سارا زور تعمیرِ خویش (SELF) پر دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ:

زندگانی ہے صدف قطرۂ نیساں ہے خودی
وہ صدف کیا کہ جو قطرے کو گہر کر نہ سکے
ہو اگر خود نگر و خود گر و خود گیر خودی
یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے

اس سے بھی زیادہ واشگاف الفاظ میں :-

ترے دریا میں طوفاں کیوں نہیں ہے
خودی تیری مسلماں کیوں نہیں ہے؟
عبث ہے شکوۂ تقدیرِ یزداں
تو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے؟ (ارمغانِ حجاز)

خودی کا مسلماں ہونا

قرآن "خودی کے مسلمان ہونے" کو ایمان کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔ ایمان چار لفظوں کے دُہرا دینے کا نام نہیں۔ یہ دل کی تبدیلی کا نام ہے۔ اقبالؒ کا فلسفۂ خودی، قرآن کے نکتۂ ایمان ہی کی تفسیر ہے۔ جب ایمان دل کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے تو پھر زاویۂ نگاہ بدل جاتا ہے، سفرِ حیات کی راہیں بدل جاتی ہیں۔ قرآن اس نگاہ کی تبدیلی کو تغیّرِ نفس کہتا ہے ـــــ دیکھئے! سورۂ حجرات میں، قرآن نے اسے کس قدر بلیغ اور لطیف انداز میں بیان کیا ہے :- ـــــ قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ـــــ یہ بدّو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں۔ ـــــ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا ـــــ ان سے کہہ دو کہ تم ابھی صاحبِ ایمان نہیں ہوئے، اس لئے تمہیں یہ نہیں کہنا چاہیئے کہ ہم ایمان لے آئے ہیں ـــــ وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا ـــــ انہیں سردست یہی کہنا چاہیئے کہ ہم نے اس نظام کی اطاعت قبول کر لی ہے ـــــ وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ (۴۹/۱۴) ـــــ ابھی ایمان تمہارے دل کی گہرائیوں میں نہیں اترا ـــــ جب یہ دل کی گہرائیوں میں اتر جائے تو پھر اقدار بدل جاتی ہیں۔ اسی کا نام تغیّرِ نفس ہے۔

جب ہم کہتے ہیں کہ صدرِ اوّل کی جماعتِ مومنین نے جو عالمگیر انقلاب برپا کر دیا تھا۔ وہ ان کے ایمان کی بدولت تھا، تو اس کا یہی مطلب ہوتا ہے کہ ان کی نگاہ کا زاویہ بدل جانے سے اشیائے کائنات کی قدر و قیمت بدل گئی تھی۔ اس کی ایک مثال تقسیمِ مالِ غنیمت کے اس وقت کے مروجہ قاعدہ میں اصلاح سے متعلق ہے۔ جیسا کہ علم ہے کہ عربوں کی معیشت اور معاشرت کا بڑی حد تک دارو مدار مالِ غنیمت اور جنگ میں گرفتار شدہ قیدیوں کو غلام اور لونڈیاں بنا لینے پر تھا۔ مالِ غنیمت پر ان کی اقتصادیات کا انحصار تھا۔ اور معاشرہ میں تمام کام کاج غلام کرتے۔ اور لونڈیاں ان کی بے محابا جنسی خواہش کی تسکین کا سامان بہم پہنچاتیں۔ یہی مفاد اور جاذبیتیں ان کیلئے جنگ کے محرکات بنتے۔ قرآن نے بیک جنبشِ قلم جنگ کی ان دونوں جاذبیتوں (محرکات) کو ختم کر دیا۔ مالِ غنیمت کے متعلق کہہ دیا کہ یہ مملکت کی تحویل میں رہے گا اور جنگ کے قیدیوں کے متعلق کہہ

دیا کہ انہیں غلام نہیں بنایا جائے گا رہا کیا جائے گا۔ (۴۷/۴) (اپنے قیدیوں کے مبادلہ کے طور پر یا معاوضہ لے کر زرِ فدیہ لے کر۔ یا محض احسان رکھ کر) جنگ کے ان محرکات کے ختم ہو جانے سے، جنگ کیلئے ان کے جوش اور ولولے کو ختم ہو جانا چاہیئے تھا۔ لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ اس کے بعد انہوں نے میدانِ کارزار میں ایسی جرأت و لسالت اور بے جگری اور استقامت کا مظاہرہ کیا، جس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ یہ کس طرح ہُوا تھا؟ نگاہ کا زاویہ بدل جانے سے۔ انہیں جنگ کا محرّک جذبہ اعلائے کلمۃ الحق بتایا گیا اور ان کی نگاہوں میں اس کی قدر و قیمت اتنی بلند ہوگئی کہ مالِ غنیمت اور غلام اور لونڈیوں کی کشش اس کے مقابلے میں ہیچ نظر آنے لگی۔ ایمان کی رُو سے اسی قسم کی (قدر و قیمت کی) تبدیلی، دنیا کی ہر شئے میں پیدا ہوگئی۔ اور اسی تبدیلی (تغیرِ نفس) سے خارج میں وہ تبدیلی نمودار ہوگئی جس کے تصوّر سے ہم ہی نہیں، ساری دنیا محوِ حیرت ہو جاتی ہے۔ ان میں یہ تغیرِ نفس کس طرح پیدا ہوگیا تھا؟ یہ حضورؐ کی تعلیم کا نتیجہ تھا۔

فریضۂ رسالت

قرآن حکیم میں حضور نبی اکرمؐ کا فریضۂ رسالت یہ بھی بتایا گیا ہے:-

وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ. (۶۲/۲)

تعلیمِ کتاب و حکمت اور تزکیۂ نفس ——— تزکیۂ نفس کے معنی آپ تطہیرِ ذات کر لیجئے یا انسانی ذات کی نشوونما مطلب دونوں کا ایک ہی ہے۔ یعنی حضور کا فریضۂ رسالت یہ تھا کہ افرادِ امت کو قرآن کے احکام و ضوابط اور اور ان کی غرض و غایت کی تعلیم اس طرح دیں کہ ان کی اہمیت ان کے دل کی گہرائیوں میں اتر جائے۔ اور اس طرح اشیائے کائنات کی اقدار کے پیمانے بدل جائیں۔ مکّہ کی تیرہ سالہ زندگی میں، حضورؐ نے، نومسلموں کی زندگی میں اسی قسم کا تغیرِ اقدار پیدا کر دیا۔ یہ حضرات جنھوں نے اسلام قبول کیا تھا، نہ باہر سے آئے تھے، نہ ہی موجود افراد کے بعد آنے والی نسل تھی۔ یہ وہی عرب تھے، جن کی قبل از اسلام (زمانۂ جاہلیت) کی زندگی کے متعلق دنیا بھر کے مؤرخین متفق ہیں کہ وہ ہر قسم کے جرائم اور مصائب سے معمور تھی۔ ان عربوں میں ایسی تبدیلی پیدا کر دینا کہ ان کی پاکیزہ سیرت اور تابندہ کارناموں پر خدا اور اس کے ملائکہ تحسین و آفرین کے پھول نچھاور کریں (۳۳/۴۳)، اسی تغیرِ نفس کا نتیجہ تھا۔

بدر و احد کے میدانوں میں مجاہدین بھی اسی طرح سربکف نکلے تھے۔ جس طرح کفار (قریش)۔ لیکن قرآن نے فریقِ اوّل کی جنگ کو فی سبیل اللہ کہا ہے اور فریقِ مخالف کی جنگ کو فی سبیل الطّاغوت (۷۶/۴) یہ فرق مقاصد و اقدار ہی کا تھا جسے تغیرِ نفس (نگاہ کی تبدیلی) نے پیدا کر دیا تھا۔

نگاہ کی تبدیلی

نگاہ کی تبدیلی یا تغیرِ نفس کو ایک اور مثال سے سمجھئے! قرآنِ کریم انسانی زندگی کا ایک مقصد متعین کرتا ہے۔ اس مقصد کی صداقت پر یقین، ایمان کہلاتا ہے۔ بالفاظِ دیگر آپ اس مقصد کو اپنی زندگی کا مقصد قرار دے لیتے ہیں۔ اس مقصد کے حصول کے لئے جس قدر جدوجہد کی جائے قرآن اسے "اعمالِ صالحہ" کہہ کر پکارتا ہے۔ قرآن کی ساری تعلیم انہی دو اصطلاحات میں سمٹ کر آجاتی ہے یعنی — امنوا و عملوا الصّٰلِحٰت — قرآنی مقصد کو اپنی زندگی کا مقصد قرار دینا اور پھر اس کے حصول کے لئے جدوجہد کرنا۔ اقبالؒ نے قرآن کی اس اساسی تعلیم کو اپنے پیغام کا محور قرار دیا، جس کے گرد اس کا سارا کلام گردش کرتا ہے۔ اس کا فلسفۂ خودی، قرآن کے نکتۂ ایمان ہی کی تفسیر ہے۔

قرآن کی رُو سے مقصد

سوال یہ ہے کہ قرآن نے مسلمانوں کا مقصدِ حیات کیا بتایا ہے جسے ان کا ایمان کہا جائے گا تفصیل میں جائیے تو اس کے لئے پورے قرآن کی تفسیر درکار ہوگی۔ لیکن اجمال کی طرف آئیے تو اس کی ایک آیت اس مقصد کو سامنے لے آئے گی اور وہ آیۂ جلیلہ یہ ہے:-

هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ (۹/۳۳)

اللہ وہ ہے جس نے اپنے رسولؐ کو ضابطۂ ہدایت اور نظامِ زندگی دے کر بھیجا جو سراسر حق پر مبنی ہے۔ مقصد اس سے یہ کہ یہ نظام، انسانوں کے خودساختہ تمام نظامات پر غالب آکر رہے گا، خواہ یہ بات مشرکین کو کتنی ہی گراں کیوں نہ گزرے۔

(اس آیت ۹/۳۳ کو آیات (۴۸/۲۸) سورۃ الفتح اور (۶۱/۹) سورۃ الصّف میں بھی دہرایا گیا ہے۔

یہ آیت اپنے مفہوم کے اعتبار سے بڑی اہم ہے۔ اس میں کہا یہ گیا ہے کہ بعثتِ نبی اکرمؐ اور نزولِ قرآن سے مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نوعِ انسان کے لئے جو نظامِ زندگی (الدّین) متعین کیا ہے، وہ انسانوں کے خودساختہ تمام نظامہائے حیات پر غالب آجائے۔ یعنی انسان اسی نظام کے تابع زندگی بسر کرے اور اس طرح ہر قسم کی غلامی سے نجات حاصل کرے۔ یاد رکھئے کہ اسلام ایک نظامِ حیات ہے (دینؔ)، مذہب نہیں۔ اس کا دنیا کے نظامہائے حیات کے ساتھ مقابلہ کرنا چاہیئے۔ مثلاً شہنشاہی نظامِ حکومت۔ آمریت، مغربی جمہوریت

(جس کا تجربہ ہمارے ہاں رائج ہے اسیکولرازم، سوشلزم اور کمیونزم وغیرہ کے ساتھ مقابلہ۔ قرآن نے جب کہا ہے کہ یہ تمام غیر خدائی نظام ہائے حیات پر غالب آجائے گا تو اس سے یہی مراد ہے۔

اس سے واضح ہے کہ اسلام ایک عظیم انقلابی پروگرام کا نام ہے جس کا مقصد اللہ کے متعین کردہ نظام کو تمام نظامہائے عالم پر غالب کرنا ہے۔ جو شخص اس نصب العین کو اپنی زندگی کا مقصد و منتہی قرار دے لیتا ہے اسے مسلم یا مومن کہا جاتا ہے اور ایسے افراد پر مشتمل گروہ کو امتِ مسلمہ یا جماعتِ مومنین، جنہیں اللہ "یا ایھا الذین اٰمنوا" کہہ کر مخاطب کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس مقصد کو اپنی زندگی کا منتہی قرار دینے کے لئے سب سے پہلے فکری اور قلبی تبدیلی کی ضرورت ہوگی۔ کیونکہ جب تک دیگر تمام مقاصد سے مُنہ نہیں موڑیں گے اسے اپنی زندگی کا واحد نصب العین قرار نہیں دے سکیں گے۔ اسی کو قرآن نفسیاتی تغیر سے تعبیر کرتا ہے۔ اس تبدیلی سے انسان کی زندگی کا مقصد بدل جاتا ہے۔ منزل بدل جاتی ہے۔ آرزو بدل جاتی ہے۔ اس کے رفقائے سفر بدل جاتے ہیں۔ سفرِ حیات کی راہیں بدل جاتی ہیں۔ اسی کا نام ماحول کی تبدیلی ہے۔ جسے قرآن "ما بقوم" کہہ کر پکارتا ہے۔ یوں قرآن کے عطا کردہ اصول کے مطابق انسان کی داخلی تبدیلی سے اس کے خارجی احوال و کوائف بدل جاتے ہیں۔ قرآن انسان کے اندر اسی قسم کی تبدیلی پیدا کرتا ہے۔

یہ ہے نگاہ کی تبدیلی جو قرآن کے مقرر کردہ نصب العین کو حیات قرار دینے سے واقع ہو جاتی ہے اور جس سے خارجی اشیاء کی اقدار بدل جاتی ہیں۔ ان کی جاذبیتیں بدل جاتی ہیں۔ اس وقت ہر عبدِ مومن کی زبان پر یہ ہوتا ہے:

عشق میں ایک تم ہمارے ہو!
باقی جو کچھ ہے سب تمہارا ہے!

قرآن حکیم نے اپنے مقرر کردہ نصب العین کی طرف لے جانیوالے پروگرام کو نظامِ صلوٰۃ سے تعبیر کیا ہے۔ اس پروگرام میں اُن اجتماعات کو بھی جنہیں اب نماز کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ بڑی اہمیت حاصل ہے۔ جب آپ اس کی نیت کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ:

اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ۔ (۶/۸۰)

"میں نے دنیا کی تمام جاذبیتوں اور مقاصد سے مُنہ موڑ کر، اللہ کے مقرر کردہ مقصد کو اپنا نصب العینِ حیات قرار دے رکھا ہے۔ میرا رُخ سیدھا اسی منزل کی طرف ہے۔ وہی میرا قبلۂ مقصود اور کعبۂ مراد ہے۔ میں اس کے ساتھ اور مقصد کشش یا جاذبیت کو شریک نہیں کرتا"۔

اس نیت کے بعد آپ اس مقصد کے حصول کی آرزو کا بار بار اعادہ کرتے ہیں ــــ یہ نفسیات کا اصول ہے کہ جس

آرزو کا بار بار اعادہ کیا جائے اس میں پختگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس طریق سے آرزو میں پختگی پیدا کرنے کا نام دعا ہے دیکھئے اقبالؒ نے اس حقیقت کو کس حُسن و خوبی سے پیش کیا ہے:-

تری دعا سے قضا تو بدل نہیں سکتی ——— مگر ہے اس سے یہ ممکن کہ تُو بدل جائے
تری خودی میں اگر انقلاب ہو پیدا ——— عجب نہیں ہے کہ یہ چار سُو بدل جائے
تری دعا ہے کہ ہو آرزو تری پوری ——— مری دعا ہے تری آرزو بدل جائے

اور آرزو کے بدل جانے سے، انسان کی ساری دنیا بدل جاتی ہے۔ خدا کہتا ہے کہ تم اپنی آرزو کو اس طرح بدلو کہ وہ ہمارے قانونِ مشیت سے ہم آہنگ ہو جائے۔ ہمارا قانونِ مشیت یہ ہے کہ مومن سب سے بُلند اور سب پر غالب ہوتے ہیں۔ (۳/۱۳۸، ۵/۵۶) تم مومن بن جانے کی آرزو کرو تاکہ تمہیں وہ مقام حاصل ہو جائے۔ آرزو بدلے بغیر ہم میں وہ تغیرِ نفس پیدا نہیں ہو سکتا جس کا قرآن اور رسول اللہ کا اسوۂ حسنہ تقاضا کرتے ہیں

رسول اللہ کا مقصدِ حیات

مُحمد الرسول اللہ والذین معہٗ (۴۸/۲۹) کی یہی آرزو و دعا تھی۔ اور ان کے سامنے وہی مقصدِ حیات تھا جو قرآن حکیم انسانی زندگی کا متعین کرتا ہے یعنی دین الحق، نظامِ خداوندی، کو نظامہائے عالم پر غالب کرنا۔ انہوں نے اپنے یقینِ محکم اور عملِ پیہم سے چند سالوں کے عرصہ میں اسے کر کے دکھا دیا۔ اس زمانے میں ایران اور رومتہ الکبریٰ کے نظام ہی دنیا میں سربلند اور غالب نظام تھے۔ قرآنی نظام نے ان دونوں نظاموں کو شکست دے کر اپنے نظام کو غالب کر کے دکھا دیا۔ یاد رہے کہ صدرِ اوّل کی فتوحات، علاقوں اور ملکوں کی فتوحات نہیں تھیں، وہ انسانوں کے وضع کردہ نظاموں پر نظامِ خداوندی کی فتح تھی۔ وہ "لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ" کا عملی مظاہرہ تھا۔

ہمارا مقصدِ حیات

اب قرآن میں پیش کردہ نظام کو تمام نظامہائے عالم پر غالب آنا ہے۔ رسول اللہ کے امتی ہونے کی حیثیت سے اب "لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ" کا عملی مظاہرہ ہمیں کر کے دکھانا ہوگا۔ بالفاظِ دیگر رسول اللہ کا مقصدِ حیات اب ہمارا مقصدِ حیات ہے۔ اس کا حصول اب ہماری ذمہ داری ہے۔ ظاہر ہے کہ اس مقصد کا حصول اسلامی حکومت کے ذریعے ہی سے ممکن ہوگا جسے امت تشکیل کرے گی۔ دوسرے لفظوں میں یہ مقصد اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا جب تک ہمارا اپنا معاشرہ مکمل طور پر قرآنی احکام و قوانین کے تابع نہیں آجاتا۔ یہی پاکستان بنانے کا مقصد تھا۔ ہم ایک علیحدہ خطۂ زمین چاہتے تھے جہاں اسلام (دین اللہ

ایک عملی نظامِ حیات کی شکل میں کارفرما ہو۔ اسی کو نظریۂ پاکستان کہتے ہیں۔

ہمیں چاہیئے تو یہ تھا کہ پاکستان بننے کے بعد اپنے مقصدِ حیات کی تجدید کرتے اور دنیا کو دکھا دیتے کہ یہی وہ دین (نظامِ زندگی) ہے جو انسانیت کے تمام مسائل کا حل اپنے اندر رکھتا ہے۔ لیکن حسرت و یاس سے کہنا پڑتا ہے کہ جس مملکت کا خواب اقبالؒ کی چشمِ بینا نے دیکھا اور جس کا تصور قائدِ اعظمؒ کی بانگِ بلند نے دیا، حصولِ پاکستان کے بعد بھی اس مملکت کا بدستور انتظار ہے:

نہ ہے لبوں پہ تبسم، نہ ہے نظر میں پیام
وہ آ گئے ہیں مگر انتظار باقی ہے

رکاوٹ

کیا ہم نے کبھی سنجیدگی سے سوچا ہے کہ نظامِ خداوندی کی راہ میں کون رکاوٹ بن کر کھڑا ہے؟ قرآن حکیم نے کہا ہے یہ تمہارے مذہبی پیشوا ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ جن مذہبی پیشواؤں کے متعلق تم سمجھتے ہو کہ یہ اللہ تک لے جانے والے راستے میں تمہارے قائد ہیں، درحقیقت دین کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ انہی کا وجود ہے۔ وَيَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللّٰهِ (۹/۳۴) ظاہر ہے کہ جب تک رکاوٹ کو راستے سے ہٹایا نہیں جائے گا۔ اسلامی نظام نافذ نہیں ہو سکے گا۔ یہ بات ہم تک ہی محدود نہیں۔ انبیاءِ گذشتہ اور اقوامِ سابقہ کی جو تاریخ قرآن نے بیان کی ہے، اس میں آپ دیکھیں گے کہ ان کی دعوت کی سب سے بڑی مخالفت مذہبی پیشواؤں کی طرف سے ہوئی۔ اللہ کے نظام سے ان کی پیشوائیت اور اقتدار ختم ہو جاتا ہے اور چونکہ یہ ان کی روٹی کا مسئلہ ہوتا ہے اس لئے وہ اس کی شدید مخالفت کرتے ہیں۔

اسلام کا مقصود اور اس کے عملی نظام (دین) کی غائت تو یہ ہے کہ نوعِ انسان کے اختلافات و افتراقات کو ختم کر کے اسے آسمانی اقدار کی بنیادوں پر ایک عالمگیر برادری بنا دیا جائے۔ لیکن مذہبی پیشوائیت، اپنی نمبرداری قائم و دائم رکھنے کیلئے، امت میں فرقہ پرستی اور پارٹی بازی میں اپنی عافیت سمجھتی ہے۔ مذہبی پیشوائیت کا سارا زور تقلید اور اسلاف پرستی پر ہوتا ہے، کیونکہ اس سے ان کی اپنی حاکمیت قائم رہتی ہے دین تو نام ہے، زندگی کے ہر گوشے میں، وحی کی روشنی میں، اپنی عقل و فکر سے کام لے کر چلنے کا۔ اس کے خلاف "مذہب" (یعنی انسانوں کا خود ساختہ طریق) ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ خدا پرستی اس طریقہ کا نام ہے جس میں انسان عقل و فکر سے کام نہ لے اور جو کچھ اسلاف سے ہوتا چلا آ رہا ہے اس پر آنکھ بند کر کے چلتا جائے۔ اسے تقلید کہتے ہیں۔ ہمارے مذہبی پیشوا "اسلاف کے مسلک" کے نام پر اپنی من مانی کرتے ہیں اور چونکہ عقل و فکر سے کام لینا انسانوں پر حرام قرار دے دیا جاتا ہے۔ اس لئے وہ انہیں ڈھور ڈنگر کی طرح جدھر جی چاہے لئے لئے پھرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد اس قوم میں سمجھنے سوچنے

کی صلاحیت ہی ختم ہو جاتی ہے۔ یہی حال اب ہمارا ہے۔

امتِ مسلمہ کا مقصدِ حیات تو دنیا میں نظامِ خداوندی کا غالب کرنا تھا۔ لیکن ہمارے مذہبی پیشواؤں نے یہ مقصد امت کی نگاہوں سے اوجھل کر کے، انفرادی نجات کو مقصودِ زندگی قرار دے دیا ہے۔ اسے کہتے ہیں دین کو مذہب میں تبدیل کرنا۔

دین اور مذہب

اللہ کی طرف سے تمام انبیاء کو دین، یعنی اللہ کا مقرر کردہ انسانوں کے لئے نظامِ زندگی، ایک ہی ملا تھا۔ (۳/۱۹) وہ دینِ اللہ تھا۔ یعنی اللہ کا عطا کردہ دین (ضابطۂ حیات)۔ سُن لیجئے! کہ اللہ نے اسلام کو اللہ کا دین کہا ہے (۵/۳، ۳/۸۳ و دیگر مقامات) مذہب نہیں کہا۔ قرآن حکیم میں مذہب کا لفظ کہیں نہیں آیا ہے۔ (مذہب کے معنی مکتبِ فکر کے ہیں۔ ابتدائے اسلام میں صرف دین تھا۔ بعد میں جب مختلف آئمہ فکر و فقہ کی نسبتوں سے مختلف طریقے پیدا ہوئے تو دین کی جگہ مذہب (طریقہ) نے لے لی۔) اللہ نے اپنے دین۔ اسلام۔ کی نسبت (اور تو اور) کسی رسول کی طرف بھی نہیں کی ہے۔ رسولؐ اللہ کے دین کو لوگوں تک پہنچانے کے لئے آتے تھے۔ وہ کوئی اپنا دین نہیں لاتے تھے۔ لیکن جب دین مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ یعنی جب دین میں انسانی خیالات کی آمیزش ہو جاتی ہے۔ تو ہر مذہب کی نسبت اس کے بانی کی طرف ہو جاتی ہے۔ مذہب پرست طبقہ اس کی اوّلین نسبت، اس شخصیت کی طرف کر دیتا ہے جسے وہ اس کا بانی قرار دیتا ہے۔ حالانکہ رسول کسی مذہب کے بانی نہیں ہوتے تھے (وہ مذہب لاتے ہی نہیں تھے۔ اس لئے اس کے بانی کیسے ہو سکتے تھے۔ وہ اللہ کا دین لاتے تھے اور چونکہ دین اللہ کا عطا کردہ ہوتا تھا اس لئے وہ اس دین کے بھی بانی نہیں ہوتے تھے) اس طرح مختلف مذاہب آپس میں ٹکراتے رہتے ہیں۔ اس کے بعد، ایک ہی مذہب میں مختلف فرقے پیدا ہو جاتے ہیں جن میں ہر فرقہ کی نسبت اس کے بانی (حقیقی یا مزعومہ) کی طرف کی جاتی ہے اور یوں ان فرقوں میں سر پھٹول ہوتی رہتی ہے۔

دینِ اللہ میں شرک کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ یعنی پہلے ہر غیر خدائی طاقت، ہر غیر خدائی تصوّر، نظریہ، عقیدہ سے منہ موڑا جائے (یَکْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ) اور اس کے بعد اللہ کے قانون پر ایمان لایا جائے۔ (یُؤْمِنْ بِاللّٰہِ) (۲/۲۵۶)۔ اگر غیر خداوندی تصوّرات و نظریات کا ذرا سا شائبہ بھی باقی رہ جائے تو یہ شرک ہوگا۔ دین میں شرک کا سایہ تک نہیں رہتا۔ لیکن جب دین مذہب میں تبدیل ہو جائے تو اس میں توحید باقی نہیں رہتی۔ کیونکہ مذہب اس راستے کو کہتے ہیں جو انسانوں کا وضع کردہ ہو اس لئے مذہب میں

مختلف فرقے ہوتے ہیں، لیکن دین میں فرقہ واریت کو شرک قرار دیا گیا ہے۔ وحدت خالق کا عملی ظہور وحدتِ امت (بلکہ وحدتِ انسانیت) کی شکل میں ہونا ضروری ہے، لہٰذا جس طرح الوہیت کے ٹکڑے کرنا شرک ہے اسی طرح وحدتِ امت کو پارہ پارہ کرنا بھی شرک ہے۔ امت کی وحدت کی بنیاد ایک خدا کے ایک ضابطہ کے مطابق زندگی بسر کرنے پر ہوتی ہے۔ چونکہ مذہب میں فرقے ہوتے ہیں اس لئے ہر مذہب شرک پر مبنی ہوتا ہے۔ اور فرقہ بندی قرآن کی رُو سے شرک ہے (۳۲-۳۱/۳۰ ، ۶/۱۶۰) لہٰذا دین میں یہ مختلف مذاہب ہوتے ہیں نہ مختلف فرقے۔ جہاں فرقے ہوں سمجھ لیجئے کہ وہاں نہ دین ہے نہ توحید۔ چونکہ پاکستان کے مسلمان فرقوں اور پارٹیوں میں بٹے پڑے ہیں، اس لئے ہمارا مروجہ اسلام، منزّل من اللہ دین نہیں ہو سکتا۔ بلکہ یہ انسانوں کا خود ساختہ مذہب ہے اور مذہب کوئی بھی ہو اس میں زمانے کے تقاضوں کے ساتھ چلنے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ جس دن یہ حقیقت ہمارے دل کی گہرائیوں میں اُتر گئی، اسی دن ہمارے اندر وہ نفسیاتی تبدیلی پیدا ہو جائے گی، جس کو قرآن حکیم، خارجی حالات میں انقلاب لانے کے لئے شرط اولین قرار دیتا ہے۔ کاش ہم سوچیں سمجھیں۔!

اس نفسیاتی تبدیلی لانے کے لئے استقامت آمیز تبلیغ کی ضرورت ہوگی، یعنی قرآنی تعلیم عام کرنی ہوگی۔ قرآنی تعلیم سے مراد وہ تعلیم نہیں جو ہمارے مذہبی مدارس میں "دینی علوم" کی شکل میں دی جاتی ہے۔ قرآن کی تعلیم ایسی ہونی چاہیئے کہ متعلّم علیٰ وجہ البصیرت یہ محسوس کرنے لگ جائے کہ بلا شک و شبہ یہ کتاب عظیم نوعِ انسان کے لئے واحد اور مکمل ضابطۂ حیات ہے اور انسانیت کی مشکلات کا صحیح حل اس کے سوا اور کہیں نہیں مل سکتا۔ اس قسم کے یقین کے بغیر، ان تباہیوں سے بچنے کی کوئی صورت نہیں جن میں ہمارا معاشرہ گھر چکا ہے۔

ہمارا بیمار معاشرہ

اِن دنوں مملکتِ پاکستان اور ملّتِ پاکستان دونوں اپنی تاریخ کے جس شدید بحران سے دو چار ہیں وہ کسی بیرونی سازش کا نتیجہ نہیں بلکہ ہمارا اپنا پیدا کردہ ہے۔ اس کا اصلی سبب ہمارا بیمار معاشرہ ہے۔ نہایت درد و کرب کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ تشتت و افتراق، تعصب و نفرت کی فضا نے ملک و قوم کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ ہر طرف لاقانونیت کا بھوت ناچ رہا ہے۔ کونسی لوٹ کھسوٹ ہے جس سے یہ ملک محفوظ ہے۔ امنِ عامہ کی صورت اس قدر مخدوش ہے کہ اندرونِ سندھ اور کراچی، حیدر آباد جیسے علاقوں پر کیا موقوف، اب ملک کے کسی حصے میں انسانی جانیں محفوظ نہیں۔ اب تو ہمارے معاشرے کی حالت یہی ہو چکی ہے کہ:

سینہ تمام داغ داغ پنبہ کجا کجا نہم

جس طرح چیچک کے علاج کے لئے ایک ایک آبلہ پر پھاہا نہیں رکھا جا سکتا۔ اسی طرح ہمارے معاشرے

کی لاتعداد بیماریوں کا الگ الگ علاج نہیں ہو سکتا۔ سوال یہ ہے کہ یہ مرکزی بگاڑ کیا ہے؟ یہ سوال بڑا اہم ہے اس لئے اگر اس کی صحیح تشخیص ہو جائے تو پھر مرض کا علاج چنداں مشکل نہیں ہوگا۔ مرکزی بگاڑ کے متعلق بھی میں تمہیداً یہی کہوں گا۔

تفصیلِ معنیٔ غمِ الفت طویل ہے !!
اور ویسے تو خفیف سا اک دل میں درد ہے

میرے نزدیک بگاڑ کے اس مرکزی نقطہ کے متعلق مختصر الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ اس وقت ہماری قوم اپنے ظاہر و باطن میں بے حد تضاد کی زندگی بسر کر رہی ہے اس سے اس کے تشخص (PERSONALITY) میں تشتت و انتشار (DISINTEGRATION) واقع ہو گیا ہے۔ اس تشتت و انتشار کو منافقت (DUAL PERSONALITY) کہتے ہیں۔ یاد رکھیئے! ایمان (اسلام) بھی اپنے نتائج رکھتا ہے۔ اور کفر بھی اپنے نتائج رکھتا ہے لیکن منافقت کا نتیجہ، فریب کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ تصور و خیال کا فریب، عمل و کردار کا فریب۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جب زندگی یکسر فریب ہو جائے تو پھر کونسا گوشۂ حیات ہے جو تعمیری نتائج کا حامل ہو سکتا ہے؟ ہماری کیفیت یہ ہے کہ جو کچھ ہم زبان سے کہتے ہیں اس پر ہمیں دل سے یقین نہیں ہے اور جو کچھ ہمارے دل میں ہے اسے زبان پر لانے کی جرأت نہیں، نتیجہ اس کا وہ اطمینان سوز جہنم ہے جس میں ہم من حیث القوم مبتلا ہیں اور جس سے نکلنے کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا۔ اسے دو ایک مثالوں سے سمجھئے!

ہم نے اوائل بیسویں صدی سے یہ کہنا شروع کیا کہ ؎

بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے
یہاں تک کہ، تہذیبِ حاضر نے جو بت تراشے ہیں۔ ؎

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیراہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

لہٰذا،

اے مصطفوی! خاک میں اس بت کو ملا دے

اس تصور کا نتیجہ تھا کہ ہم نے اسلام کی عالمگیر برادری کے راستے میں وطن کی چار دیواری کو کبھی حائل نہیں ہونے دیا۔ یہی وجہ تھی کہ جب پاکستان کی بنیاد اس دعویٰ پر رکھی گئی کہ اسلام میں قومیت کا مدار اشتراکِ وطن نہیں بلکہ آئیڈیالوجی کی یکسانیت (دین) ہے۔ تو ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے یہ کوئی نئی آواز نہیں تھی۔

دس برس کی اس پیہم پکار کے بعد ہمیں پاکستان مل گیا۔ لیکن پاکستان ملنے کے ساتھ ہی مختلف گوشوں سے ایسی آوازیں اٹھنی شروع ہوگئیں جو اس امر کی غمّازی کرتی تھیں کہ معیارِ قومیّت کے متعلق جو کچھ ہم دس برس سے مسلسل کہتے چلے آرہے تھے، اس پر ہمیں یقین نہیں تھا۔ نتیجہ اس کا یہ کہ ہمارے قول و عمل میں تضاد واقع ہونا شروع ہوگیا۔ ہم پاکستان میں بسنے والوں غیر مسلموں کو مسلم قومیّت کے دائرے سے باہر بھی قرار دے رہے تھے اور اس کے ساتھ انہیں پاکستانی قومیّت کے پورے حقوق بھی دیئے جا رہے تھے۔ یہاں ہو یہ رہا ہے کہ جب مسلم اور غیر مسلم، الگ الگ دروازوں سے (یعنی جداگانہ انتخاب سے) قومی یا صوبائی اسمبلی کے ہال میں پہنچ جاتے ہیں تو وہاں پہنچ کر دونوں ایک قوم کے افراد قرار پا جاتے ہیں۔ وہاں غیر مسلموں کو بعینہٖ مسلمانوں جیسے حقوق حاصل ہوتے ہیں۔ وہاں جتنے مسائل پیش ہونگے ان میں غیر مسلم برابر کا حصّہ لیں گے۔ حتیٰ کہ اسلامی آئین اور قوانین وضع کرنے میں بھی غیر مسلموں کو رائے دہندگی کا پورا پورا حق حاصل ہے۔ اور ہو سکتا ہے کہ بعض دینی معاملات کا آخری فیصلہ انہی کی آراء کے وزن سے ہو۔ اب آپ ہی کہئے کہ یہ "دو قومی قرآنی نظریہ" سے سیاست نہیں کھیلی جا رہی ہے تو اور کیا ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ جو غیر مسلم، مسلم ضابطۂ قوانین کی اصل و اساس کی صداقت کو تسلیم نہیں کرتا وہ اس کے قوانین کی ترتیب میں شریک کیسے ہو سکتا ہے؟ لیکن یہاں ہو یہی رہا ہے جو اوپر بتایا گیا ہے۔ اس طرح ہم وطنیّت کو معیارِ قومیّت قرار دے کر پاکستان کی وجۂ جواز کی خود ہی نفی کر رہے ہیں۔ (جہاں تک غیر مسلموں کے حقوق کا تعلّق ہے وہ ایک علیحدہ بحث ہے)

ہم بھول گئے کہ "دو قومی نظریہ" کا خالق کوئی انسان نہیں، بلکہ خود خالقِ کائنات ہے۔ یہ نہ تو ہندوستانی باشندوں کی نسبت سے وجود میں آیا تھا اور نہ ہی تحریکِ پاکستان کا پیدا کردہ تصوّر تھا۔ یہ اسلام کی ایک ابدی حقیقت ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے:

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ ط (۶۴/۲)

"اللہ نے تمہیں پیدا کیا، پھر تم میں سے کچھ مومن ہو گئے اور کچھ کافر"

یعنی پیدائش کے اعتبار سے صرف انسان پیدا ہوتے ہیں، پھر وہ نظریۂ زندگی کے اختلافات کی بنیاد پر دو گروہوں میں بٹ جاتے ہیں۔ ایک گروہ مومنین کا اور دوسرا غیر مسلموں کا۔ اسی کو دو قومی نظریہ کہا جاتا ہے اس کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ مسلم اور غیر مسلم ایک قوم قرار نہیں دیئے جا سکتے۔ اب ہم دو قومی نظریہ کا مذاق اڑا رہے ہیں جب کہہ رہے ہیں کہ یہاں کے مسلم اور غیر مسلم تو ایک قوم کے افراد ہیں، لیکن خود مسلمان ایک قوم کے افراد نہیں۔ ان کی چار الگ الگ قومیتیں ہیں! یا للعجب!!

ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہئے!!

یاد رہے کہ مسلمان قوم کے اندر نسل، زبان، جغرافیائی یا سیاسی حدود کے امتیاز سے مختلف قوموں کی تشکیل اسلام کے بنیادی تصوّر کے خلاف ہے۔

قرآن کو "مہجور" بنا دیا

اب آگے بڑھیے! پاکستان کے مطالبہ کی بنیاد اس دعویٰ پر رکھی گئی تھی کہ چونکہ ہم ایک علیحدہ قوم ہیں اس لئے ہمیں ایک علیحدہ خطۂ زمین چاہیئے جہاں ہم ایک ایسی حکومت قائم کر سکیں جو اسلامی (قرآنی) خطوط پر متشکل ہو یہی وہ دعویٰ تھا جس کی بنیاد پر ہم متحدہ ہندوستان کے تصوّر کو یہ کہہ کر ردّ کیا کرتے تھے کہ اس قسم کی مخلوط حکومت میں ہم اپنے دینی تصوّر کے مطابق زندگی بسر نہیں کر سکتے۔ لیکن جب پاکستان مل گیا تو ہم نے اپنے اس دعویٰ سے گریز کی راہیں نکالنی شروع کر دیں۔

اب ملکِ عزیز پاکستان میں، قرآن حکیم کو عملی زندگی کا ضابطۂ حیات بنانے کی بجائے مذہبی فرقوں کی حکمرانی ہے۔ قرآن حکیم نے فرقہ پرستی اور پارٹی بازی کو شرک قرار دیا ہے۔ ($\frac{30}{31-32}$، $\frac{6}{160}$) لیکن ہماری خودساختہ "مذہب وشریعت" نے فرقوں کو جائز ٹھہرا لیا ہے۔ اور ہمارے مروّجہ آئین نے اس "شرک" کو آئینی اور قانونی تحفظ دے رکھا ہے۔ (دیکھئے آئین کا آرٹیکل نمبر ۲۲۷ (۱) وضاحتی نوٹ)۔ قرآن حکیم کو "مہجور" بنانے کی اس سے بدترین مثال اور کیا ہو سکتی ہے۔ یہ حقیقت ہماری نگاہوں سے اوجھل کر دی گئی ہے کہ حضور نبی اکرمؐ "خلقِ جدید" کے دور میں ($\frac{14}{49}$، $\frac{32}{10}$) اللہ سے اپنی قوم/امت کے بارے میں شکائت کریں گے کہ:۔

یٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا ھٰذَا الْقُرْاٰنَ مَھْجُوْرًا ۰ ($\frac{25}{30}$) اور رسولؐ کہے گا کہ اے میرے رب! یہی ہے میری وہ قوم (امت) جس نے اس قرآن کو اپنے خودساختہ معتقدات، خیالات، تصوّرات، روایات، قوانین، تفاسیر وغیرہ کی رسیوں میں اس طرح جکڑ دیا تھا کہ یہ آزادی سے دو قدم چلنے کے قابل بھی نہیں رہا تھا۔ (یعنی انہوں نے اپنے آپ کو اس کے تابع رکھنے کے بجائے اسے اپنے اپنے مسلک ومشرب کے تابع رکھ چھوڑا تھا۔)"

ستم ظریفی یہ ہے کہ ہمارے مذہبی پیشوا اپنے پیروکاروں کو یہ کہہ کر مطمئن کر دیتے ہیں کہ حضورؐ یہ شکایت ہمارے بارے میں نہیں بلکہ کفارِ قریش کے بارے میں کریں گے۔ یہ حضرات ذرا نہیں سوچتے کہ کفارِ قریش تو قرآن کو سرے سے مانتے ہی نہیں تھے۔ اس لئے ان کے ہاتھوں سے "قرآن کا مہجور" بننے کا کیا سوال؟ یہ شکائت قرنِ اوّل کی جماعتِ مومنین کے بارے میں بھی نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ انہیں قرآن نے **"مومنین حقًّا"** ($\frac{8}{4}$) کہہ کر پکارا ہے۔ اس سے واضح ہے کہ یہ شکایت صدرِ اوّل کے بعد کے مسلمانوں کے بارے میں

ہوگی یعنی ہماری (موجودہ مسلمانانِ عالم) اور خاص طور پر پاکستان کے مسلمانوں کی جنھوں نے اپنے خود ساختہ دستور میں پرسنل (شخصی) لاز اور پبلک لاز میں تفریق کرکے قرآن حکیم کے واضح احکام کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دی ہیں۔ دین کے حصّے بخرے کر دیئے ہیں۔

دین کے حصّے بخرے کر دیئے

دین ایک نظامِ حیات عطا کرتا ہے۔ اور حیات (زندگی) کی صورت یہ ہے کہ وہ ناقابلِ تقسیم وحدت (INDIVISIBLE UNIT) ہے جس کے حصّے بخرے نہیں کئے جا سکتے۔ اور جب دین، نظامِ حیات عطا کرتا ہے تو ظاہر ہے کہ اسے بھی مختلف حصّوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ اسے قبول کیا جائیگا تو پورے کا پورا۔ اور مسترد کیا جائیگا تو پورے کا پورا۔ اسی لئے کہا گیا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً ۠ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝ (۲/۲۰۸)

اے جماعتِ مومنین! تم اس جماعت میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے نقشِ قدم کی پیروی مت کرو۔ وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ دین کے حصے بخرے کر دینا شیطان کا اتباع ہے۔ کتاب اللہ کے بعض حصّوں کو قبول کر لینا اور بعض سے انکار کر دینا کفر ہے۔ کھلا ہوا کفر۔ اور اس کا نتیجہ اس دنیا میں ذلّت و خواری اور اُخروی زندگی میں عذابِ الیم۔ کیا ہم سوچیں گے کہ ہمارے ہاں دین نہیں سیکولرازم رائج ہے۔

سیکولرازم

عصرِ حاضر کی سیاسی اصطلاح میں اس نظام کو جس میں انسانی زندگی کو دو حصّوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے، سیکولرازم کہتے ہیں۔ اس میں ہر شخص کو اپنے اپنے عقیدہ کے مطابق پوجا پاٹ، پرستش، نماز، روزہ اور دیگر مذہبی رسوم کی ادائیگی کی اجازت ہوتی ہے۔ لیکن "دنیاوی امور" (پبلک لاز) انسانوں کے وضع کردہ قوانین کی رُو سے طے پاتے ہیں۔ "یہ کتاب کے ایک حصّے پر ایمان اور دوسرے حصّے سے کفر" کی بیّن مثال ہے۔ قرآنِ حکیم نے ان امور کو دو حصّوں میں تقسیم نہیں کیا۔ لیکن ہماری جرأت تو دیکھئے کہ ہم نے دین کو پرسنل لاز اور پبلک لاز (مذہب اور سیاست) میں تقسیم کرکے اللہ کے دین کو "مذہب" میں تبدیل کر رکھا ہے۔ ہمارے مروّجہ مذہب میں کتاب اللہ کے بعض احکام پر تو بہر حال عمل ہو رہا ہے۔ کیا ان اعمال کا کوئی خوشگوار نتیجہ مرتّب ہوا ہے؟ کیا ہمارے معاشرے کی ابتر حالت کچھ بہتر ہوئی ہے؟؟

ہم اس حقیقت کو تسلیم کرنے سے کیوں جھجکتے اور جھینپتے ہیں کہ ہمارے ہاں درحقیقت سیکولرازم رائج ہے۔ آئین کی رُو سے تو ہماری مملکت "اسلامی جمہوریہ" ہے۔ لیکن عملاً یہاں یہ حالت ہے کہ مرکزی حکومت کی مختلف وزارتوں میں ایک وزارت "امورِ مذہبی" کی بھی ہے۔ گویا "مذہبی امور" ان امور سے الگ ہیں جو دیگر وزارتوں سے متعلق ہیں۔ اگر اسلامی نظام اسی کا نام ہے کہ مملکت میں ایک وزارت "امورِ مذہبیہ" سے متعلق بھی ہو تو اس کی ضمانت تو ہندو بھی دیتا تھا۔

چونکہ ہم کھُلے بندوں اس حقیقت کو تسلیم نہیں کرتے کہ ہمارے ہاں درحقیقت سیکولرازم رائج ہے اس لئے ہم قوم میں سیکولرازم کا سا تغیرِ نفس بھی پیدا نہیں کرتے۔ ــــ سیکولرازم تو جوانوں کو وطن پرستی (PATRIOTISM) کی تعلیم دیتی ہے اور ان میں کوٹ کوٹ کر یہ جذبہ بھر دیتی ہے کہ ــــــ (MY COUNTRY - RIGHT OR WRONG)۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی قوم کے افراد، قومی مفاد کو انفرادی مفاد پر ترجیح دیتے ہیں۔ اور نہ ہی ہمارے ہاں دین (قرآنی نظام) ہے۔ اس لئے ہم قرآنی اقدار کے لئے تغیرِ نفس پیدا کرنے کی کوشش بھی نہیں کرتے۔ یہاں تغیرِ نفس کے بغیر تغیرِ احوال کی کوشش کی جارہی ہے۔ اور (بدقسمتی) اسے "احیاءِ اسلام" کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ تغیرِ نفس کے بغیر تغیرِ احوال کی کوشش کرنا اور سمجھنا کہ اس میں ہمیں کامیابی ہو جائے گی، درحقیقت خدا کو چیلنج دینے کے مترادف ہے۔ (معاذاللہ ثم معاذاللہ) ایسا سمجھنے والوں کے متعلق قرآن کا ارشاد ہے:

فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ (۱۸/۱۰۵)

"ان کا کیا کرایا سب رائگاں جائے گا"

احیاءِ اسلام

اسلام کی اس (مزعومہ) احیاء نو کے لئے ہم نے کیا یہ ہے کہ فقہ کے صدیوں کے فرسودہ اور ناقابلِ عمل قوانین میں قدرے ترمیم کر کے انہیں اسلامی قوانین (حدود آرڈیننس) کے نام سے نافذ کر دیئے ہیں۔ اور ستم ظریفی یہ ہے کہ ان کے نفاذ کے کچھ ہی دیر بعد اس کا اعتراف بھی کر لیا کہ یہ ناممکن العمل ہیں۔ ہم اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ جب تک قوانین کا احترام دل میں نہ ہو اُن پر عمل ہو ہی نہیں سکتا۔ قوانین کے احترام کا (قرآنی) طریق یہ ہے کہ پہلے قانون کی پوری پوری وضاحت کی جائے۔ پھر سمجھایا جائے کہ اس کی غرض و غائت، علت و حکمت مقصود و منتہیٰ کیا ہے۔ وہ کس طرح ہمارے لئے مفید ہے۔ اس سے ہماری دنیا اور عاقبت کس طرح سنورے گی۔ اس سے تغیرِ نفس پیدا ہوگا اور قانون کا احترام دل کی گہرائیوں سے ابھرے گا۔

جرائم کس طرح مٹ سکتے ہیں؟

تغیرِ نفس کے بغیر قانون سازی یا نفاذِ قانون کی صورت میں ہوتا یہ ہے کہ ادھر قانون مرتب کرنے کی کوشش ہو رہی ہوتی ہے اور ادھر قانون شکن عناصر یا افراد اس قانون سے گریز، اغماض یا فرار کی راہیں تراش رہے ہوتے ہیں۔ قانون کس طرح اپنا نتیجہ مرتب کرتا ہے۔ اس کے لئے قرآنِ حکیم نے بڑی وضاحت سے بتایا ہے اس کا ارشاد ہے:

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ

"اے رسولؐ! تیرا رب اس حقیقت پر شاہد ہے کہ یہ لوگ کبھی صاحبِ ایمان نہیں ہو سکتے جب تک اپنے متنازعہ امور میں تجھے حاکم نہ بنائیں اور فیصلہ کے لئے تیری طرف رجوع نہ کریں ——— اس سے آگے ہے!

ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا (۴/۶۵)

"پھر جو فیصلہ تو دے اس کے خلاف اپنے دل میں (اپنے نفس میں) بھی کسی قسم کی گرانی محسوس نہ کریں اور یوں قانون کی اطاعت کریں"

قانون کے مطابق دل میں گرانی محسوس نہ کرنا، تغیرِ نفس کے بغیر ناممکن ہے۔ اور قانون کے نتیجہ خیز ہونے کا یہی طریق ہے۔ یہ جو دنیا میں (بالعموم) اور ہمارے ہاں بالخصوص اچھے اچھے قوانین کی موجودگی میں جرائم کی تعداد بڑھتی جاتی ہے، اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ دلوں میں قوانین کا احترام نہیں پیدا ہوا۔ اور یہ احترام تغیرِ نفس کے بغیر ناممکن ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے چائے کے لئے پانی کی پتیلی چولھے پر رکھیں لیکن نیچے آگ نہ جلائیں۔

داخلی کشاکش کا نتیجہ

اس داخلی کشاکش کا سب سے زیادہ مضرت رساں نتیجہ یہ نکلا کہ ہم پاکستانی نہ تو قرآن کے بلند آئیڈیل کے مطابق ایک عالمگیر مسلم قوم بن سکے ہیں اور نہ ہی سیکولرازم کے عام تصور کے مطابق، پاکستان کی حدود کے اندر ایک قوم کے پیکر میں ڈھل سکے ہیں۔ اب آپ ہی کہئے کہ اگر کسی مملکت میں دس گیارہ کروڑ نفوس محض افراد کی حیثیت سے بستے ہوں اور وہ قومیت کے (بلند قرآنی یا پست وطنی) تصور کے تحت ایک قوم نہ بن سکے ہوں تو اس مملکت کی حالت کیا ہوگی۔؟ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت ہم میں قومیت کی اجتماعی زندگی کا شعور ہی موجود نہیں۔ ہم نے اپنے آپ کو کبھی ایک قوم کا جزو محسوس نہیں کیا۔ "باب الاسلام" کے صوبے میں جو کچھ

ہو رہا ہے وہ آپ کی آنکھوں کے سامنے ہے۔ ہم سب انفرادی زندگی بسر کر رہے ہیں، اس لئے ہمارے سامنے انفرادی مفاد سے بلند کوئی مفاد نہیں ہوتا۔ نہ چھوٹے کے سامنے، نہ بڑے کے، نہ ادنیٰ کے سامنے نہ اعلیٰ کے نہ غریب کے سامنے نہ امیر کے، نہ افسر کے سامنے نہ ماتحت کے، نہ مسٹر کے سامنے، نہ مولانا کے، نہ دیانتدار کے سامنے نہ بد دیانت کے (ہماری دیانت داری، مستقل اقدار کے اتباع کی تو کجا، قومی مفاد کے جذبہ کی پیدا کردہ بھی نہیں۔ محض لاشعوری رجحانِ طبیعت کا نتیجہ ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قوم کو دیانت داروں کی نااہلی اور غلط نگہی سے بھی اسی قدر نقصان پہنچ رہا ہے جس قدر بددیانتوں کی بددیانتی سے۔ جب تک ہم میں مسلم قومیت کا شعور بیدار نہیں ہوتا، پاکستان کی فلاح و بہبود کی کوئی شکل پیدا نہیں ہو سکتی۔

علاج اس انتشار (CHAOS) سے نکلنے کی ایک ہی صورت ہے: اگر ہم مسلمان کی زندگی جینا چاہتے ہیں تو ہمیں اس پر یقین ہونا چاہیئے کہ مسلم قومیت کا معیار اشتراکِ دین ہے اور امت کی وحدت کی بنیاد ایک خدا کے ایک ضابطہ کے مطابق زندگی بسر کرنے پر ہوتی ہے۔ جہاں فرقے اور پارٹی بازی ہے۔ سمجھ لیجئے کہ وہاں نہ دین ہے نہ توحید۔

اس امتِ منتشرہ کو پھر سے امتِ واحدہ بنانے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے یہ سمجھیں کہ ہمارے ہاں جو "اسلام" رائج ہے وہ منزل من اللہ دین نہیں بلکہ انسانوں کا خود ساختہ مذہب ہے اور مذہب کوئی بھی ہو اس میں وقت کے تقاضوں کا ساتھ دینے کی صلاحیت نہیں ہوتی، اور پھر ہمارے مروجہ مذہب یعنی ہمارے فرقوں والے "اسلام" کو پھر سے دین میں بدلنے کے لئے صدقِ دل سے جدّ و جہد کریں۔ اس تغیرِ نفس کے بغیر ہماری قوم کی حالت نہیں سُدھر سکتی۔ ہمیں اپنے حکمرانوں کو واشگاف الفاظ میں بتانا ہوگا کہ برِّ صغیر کے مسلمانوں نے پاکستان کو مذہبی فرقوں کے پنپنے کے لئے حاصل نہیں کیا تھا۔ اس خطۂ ارضی میں اللہ کے دین۔ اسلام۔ کا نفاذ ہمارا نصب العین تھا۔ یہی وہ دین تھا جو اس پہلی اسلامی حکومت کا آئین تھا، جسے نبی اکرمؐ نے مدینہ میں تشکیل فرمایا تھا۔ یہی دوسری اسلامی حکومت۔ پاکستان۔ کا آئین ہونا چاہیئے تھا۔ یہی رسول اللہ کی بہترین سنّت تھی۔ لیکن ہم نے قرآن اور سنّتِ رسول اللہ کو پسِ پُشت ڈال کر یہاں اب مذہب کی عملداری قائم کر دی ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ہمارے معاشرے کا قرآنی علاج ۔ تجدیدِ مقصد

سابقہ اقوام جب اس سطح پر اُتر آئی تھیں جس پر آج ہم ہیں تو ان کی طرف اللہ کا ایک اور رسول آجاتا تھا۔ جو اللہ کے نظام کو ان کے سامنے پھر سے رکھ دیتا تھا۔ اور اس طرح مذہب کو دین میں

بدل دیتا تھا۔ لیکن حضور کی طرف نازل کردہ ضابطۂ حیات چونکہ مکمل غیر متبدل، محفوظ اور تمام نوعِ انسان کے لئے قیامت تک نظام خداوندی کا منشور تھا اس لئے حضورؐ کے بعد کسی مامور من اللہ کے آنے کی ضرورت نہ تھی۔ اس سے کہا گیا کہ اگر تمہارا دین بھی مذہب سے بدل جائے تمہارا کرنے کا کام یہ ہوگا کہ تم قرآن کے متعین کردہ مقصد، یعنی دینِ خداوندی کو نظامہائے عالم پر غالب کرنے کا مقصد از سر نو اپنے سامنے رکھ لو۔ سمجھنے کی خاطر اسے تجدیدِ مقصد کہہ لیجئے۔ دیکھئے قرآن حکیم اس عظیم حقیقت کو کس قدر بلیغ انداز میں پیش کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ:۔

یَآ اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَالْکِتٰبِ الَّذِیْ نَزَّلَ عَلٰی رَسُوْلِہٖ ۴/۱۳۶

اس کا عام ترجمہ یہ کیا جاتا ہے:۔

"اے ایمان والو! ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسولؐ پر اور لاؤ ایمان اس کتاب پر جسے اللہ نے اپنے رسولؐ پر نازل کیا"

یہاں یہ بات بظاہر عجیب سی لگے گی کہ جن لوگوں کو خدا خود "اے ایمان والو!" کہہ کر مخاطب کرتا ہے انہیں ایمان لانے کے لئے کیوں کہا جا رہا ہے۔ یہ بڑی عظیم حقیقت ہے اور گہرے غور و فکر کی محتاج۔

جو قوم مذہب کی سطح پر اتر آتی ہے لیکن اپنے آپ کو منسوب اسی دین کی طرف کر لی رہتی ہے، قرآن انہیں دیگر مذاہب سے الگ کر کے، ان کے ملی تشخص کو تسلیم کرتا ہے اس نہج سے انہیں، "یا اَیُّھَا الَّذِیْنَ" کہہ کر مخاطب کرتا ہے۔ لیکن چونکہ انہوں نے اللہ کے مقرر کردہ مقصد کو فراموش کر دیا ہوتا ہے اس لئے ان سے کہتا ہے کہ تم پھر سے اپنے سامنے اسی مقصد کو رکھ لو۔ اسی کو میں نے تجدیدِ مقصد کہہ کر پکارا ہے۔ اس حقیقت کو سورۃ الصّفؔ میں مزید وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد ہے۔

یُرِیْدُوْنَ لِیُطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰہِ بِاَفْوَاھِھِمْ وَاللّٰہُ مُتِمُّ نُوْرِہٖ وَلَوْ کَرِہَ الْکٰفِرُوْنَ (۶۱/۸)

"ان کے (یعنی کفار / مخالفین کے) ارادے یہ ہیں کہ یہ خدا کے اس نور کو اپنی پھونکوں سے بجھا دیں لیکن خدا اپنے نور کو مکمل کر کے رہے گا، خواہ یہ بات کفار (مخالفین) پر کتنی ہی گراں کیوں نہ گزرے"

سوال یہ ہے کہ خدا کا یہ "نور" کیا ہے؟ جس کے بجھانے کی تدابیر مخالفین کرتے ہیں اس کا جواب اگلی آیت میں دے دیا ہے کہ:۔

هُوَ الَّذِىٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ (۶۱/۹)

"خدا وہ ہے جس نے اپنے رسولؐ کو ضابطۂ حیات اور دین الحق (حق پر مبنی نظام) دے کر بھیجا تاکہ اسے تمام نظامہائے عالم پر غالب کر دے خواہ یہ بات مشرکین پر کتنی ہی گراں کیوں نہ گزرے"

اس سے ظاہر ہے کہ یہ "نور" جسے بجھا لے (ناکام بنانے) کی سازشیں ہوں گی۔ خدا کا متعیّن فرمودہ نظامِ زندگی (دینؔ) ہے۔ اللہ کے دینؔ کو مذہب میں بدل کر رکھ دینا، اس کے خلاف سب سے بڑی سازش ہے۔ اس کے بعد ہے؛

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ (۶۱/۱۰)

"اے ایمان والو! کیا ہم تمہیں ایسی تجارت کا پتہ نشان نہ بتائیں جو تمہیں الم انگیز عذاب سے بچا لے"۔ وہ تجارت کیا ہے؟!

تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ۚ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۔ (۶۱/۱۱)

یہ کہ تم ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسولؐ پر، یعنی نظامِ خداوندی کی صداقت اور محکمیت پر پورا پورا یقین رکھو جو اس کے رسولؐ کے ہاتھوں متشکّل ہو رہا ہے۔ اس نظام کے قیام اور استحکام کے لئے پوری پوری جدّوجہد کرو، اس کے لئے اپنا مال و دولت بھی صرف کرو اور ضرورت پڑنے پر اپنی جانیں تک بھی لڑا دو۔ اگر تم علم و بصیرت سے کام لے کر غور کرو گے تو تمہیں نظر آجائے گا کہ اس کاروبار میں کتنا منافع ہے۔ (۶۱/۱۱)

اس کے بعد کہا گیا ہے کہ یہ کچھ، خدا خود بخود نہیں کر دے گا۔ انسانوں کی دنیا میں اس کا پروگرام خود انسانوں کی رفاقت سے، انہی کے ہاتھوں پورا ہوتا ہے۔ اس لئے اے جماعتِ مومنین! تم اس نظام کے قیام کے لئے خدا کے دست و بازو بن جاؤ۔ "انصار اللہ" بن جاؤ، اور جب تم ایسے بن جاؤ گے تو تمہیں خدا کی نصرت اور فتح نصیب ہو جائے گی۔ (۶۱/۱۴)

یہ ہے عزیزانِ من! قرآنی علاج اس ذہنی انتشار اور علمی خلفشار کا جس میں ہماری قوم اس بُری طرح سے گرفتار ہے اور جو ہمیں دن بدن تباہی کے جہنّم کی طرف کشاں کشاں لے جا رہا ہے۔ علاج ایک بار پھر سُن لیجئے!! اللہ کے دینؔ کی صداقت اور محکمیّت پر دل کی گہرائیوں سے یقین اور اس کے قیام کے لئے ہمیں موجودہ مذہب کو مٹانا ہوگا۔ دوسرے لفظوں میں اللہ کے دینؔ کو ہمارے مروّجہ ،

"سیکولر نظام" پر غالب کرنا ہوگا۔ قرآن اس نگاہ کی تبدیلی کو تغیرِ نفس کہتا ہے اور بتاتا ہے کہ تغیرِ نفس کے بغیر تغیرِ احوال ممکن نہیں (۱۳/۱۱) ایسے "تغیر" کے بغیر ہمارے معاشرے کی موجودہ حالت نہیں بدل سکتی چاہے ہم کچھ بھی کر لیں۔ ؎

جنہیں حقیر سمجھ کے بجھا دیا تم نے
وہی چراغ جلیں گے تو روشنی ہوگی

حرفِ آخر / خلاصۂ گفتگو

سوچنے کی بات ہے کہ ایک اسلام وہ تھا جسے محمد رسول اللہ والذین معہٗ رضی نے پیش کیا تھا جس سے اقوامِ عالم کی امامت ہمارے حصے میں آگئی تھی۔ اور ایک اسلام ہمارا آج کا ہے جس سے ہمارا (یعنی مسلمانانِ عالم کا) شمار دنیا کی پست ترین قوموں میں ہوتا ہے، جبکہ وہ اسلام، جس نے اس وقت ہمیں وہ سرفرازیاں عطا کی تھیں۔ ہمارے پاس آج بھی اللہ کی زندہ و پائندہ کتاب 'القرآن' میں محفوظ ہے۔ پھر کیا بات ہے کہ ہمارا مروّجہ اسلام، مسلمانانِ عالم میں عام طور پر اور اسلام کے نام پر حاصل کئے جانے والے مُلک 'پاکستان' میں خاص طور پر وہ نتائج پیدا نہ کر سکا جو صدرِ اوّل کے مسلمانوں کو حاصل تھے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ قرنِ اوّل کی جماعتِ مومنین کے شرف و عظمت کا راز تمسک بالقرآن میں تھا۔ (۴۳/۴۴، ۲۰/۲) لیکن جب بعد میں آنے والوں نے (یعنی ہم نے) قرآن حکیم کو چھوڑ دیا۔ اور مختلف شخصیتوں کی طرف منسوب کردہ مذاہب کے پیچھے چل پڑے، تو شرفِ عظیم سے محروم ہو گئے۔ یہی وہ شکایت ہے جو نبی اکرمؐ خدا سے کریں گے۔

وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا (۲۵/۳۰)

"اور رسولؐ کہے گا کہ اے میرے رب! یہی ہے میری وہ قوم جنھوں نے اپنے آپ کو قرآن کے تابع رکھنے کے بجائے اسے اپنے اپنے مسلک و مشرب کی رسیوں میں اس طرح جکڑ دیا تھا کہ یہ آزادی سے دو قدم چلنے کے قابل بھی نہیں رہا تھا"

اس لئے کہ الدّین وہی ہے جو قرآن کریم کے اندر تھا۔ قرآن کو چھوڑ دینے سے الدّین چھوٹ گیا۔ آج پھر اسی الدّین سے تمسک ہو سکتا ہے اگر ہم اس حقیقت کو سمجھ لیں کہ الدّین اور قرآنِ حکیم ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں۔ دین قرآنِ حکیم کے اندر ہے اور جو بات قرآن کے اندر نہیں وہ دین نہیں، اور قرآن کے مثلہٗ کوئی اور چیز نہیں ہو سکتی۔ ارشادِ خداوندی ہے کہ "اگر انس و جن سب کے سب مل کر بھی

کوشش کریں، وہ قرآن کی مثل نہیں لاسکتے خواہ وہ ایک دوسرے کے کتنے ہی مددگار کیوں نہ بن جائیں۔ (۱۷/۸۸)
اس سے واضح ہے کہ دین کا منبع صرف اور صرف قرآن ہے۔ رسول اللہؐ نے قرآن کی اتباع کی اور دوسروں سے کرائی۔ لہٰذا حضورؐ کا کوئی قول، فعل، عمل قرآن کے خلاف نہیں ہوسکتا۔ یہی دین تھا جو اس پہلی اسلامی مملکت کا آئین (CONSTITUTION) تھا جسے حضور نبی اکرمؐ نے مدینہ میں متشکل فرمایا تھا۔ ہم نے یہ اسلامی نظام دیکھا نہیں۔ لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ یہ نظام حضور رسالتمآبؐ کے ہاتھوں متشکل ہوا اور حضرت عمرؓ کے زمانے میں پروان چڑھا۔ یہ نظام باقی نہ رہا، لیکن لوحِ زمانہ پر اس کی یادگار اب تک منقوش ہے۔ بقول غالبؔ:

ہنوز اک پرتوِ نقشِ خیالِ یار باقی ہے

ہم نے ایسی ہی اسلامی مملکت قائم کرنے کے لئے، ایک علیحدہ خطۂ ارضی کا مطالبہ کیا تھا۔ حضرت علامہ اقبالؒ نے اپنی قرآنی بصیرت کی روشنی میں، اسلام کا تصور، بحیثیت دین کے پیش کیا تھا اور جس امت کو "یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" کہہ کر اللہ، رسول اور اس کی کتاب پر ایمان لانے کے لئے کہا تھا، اس امت سے کہا کہ وہ اپنے مقصدِ حیات کی تجدید کرے اور نظامِ خداوندی کو دوبارہ متشکل کرکے اسے دنیا کے تمام نظاموں پر غالب کرکے دکھا دے۔ پاکستان کا نظریہ اقبالؒ کی اسی دعوت کی عملی تشکیل کا نام تھا۔ الدّین کو اس کی اصلی شکل میں پیش کرنے کی صورت یہی تھی کہ قرآن حکیم کو عملی زندگی کا ضابطہ بنانے کی کوشش کی جائے۔ یہی وہ کوشش تھی جو ہمارے زمانے میں تحریکِ پاکستان کی شکل میں سامنے آئی۔ پاکستان تو مذہبی پیشوائیت کی شدید مخالفت کے باوجود بن گیا لیکن پاکستان بننے کے بعد، ہم اس کے بنانے کا مقصد ہی بھول گئے۔ اپنا مقصدِ حیات ہی بھول گئے اور بھولے چلے آرہے ہیں۔ یہاں اب اللہ کی حکمرانی، کتاب اللہ کے ذریعے، کی بجائے مذہبی فرقوں کا دَور دَورہ ہے۔ اور جیسا کہ آپ کو علم ہے ہمارے مروجہ آئین نے ہر فرقے کو اجازت دے رکھی ہے کہ "قرآن وسنّت" کی اصطلاح کی تعبیر وتشریح، شخصی قوانین کی حد تک اپنے اپنے فقہ ومسلک کے مطابق کرسکتا ہے۔ (دیکھئے آئین کا آرٹیکل نمبر ۲۲۷ (۱) وضاحتی نوٹ) انگریزی میں یہ آرٹیکل یوں ہے:-

227. PROVISIONS RELATING TO THE HOLY QURAN AND SUNNAH:- (1) ALL EXISTING LAWS SHALL BE BROUGHT IN CONFORMITY WITH THE INJUNCTIONS OF ISLAM AS LAID DOWN IN THE HOLY QURAN AND

SUNNAH, IN THIS PART REFERRED TO AS THE — INJUNCTIONS OF ISLAM, AND NO LAW SHALL BE ENACTED WHICH IS REPUGNANT TO SUCH INJUNCTIONS.

[EXPLANATION :- IN THE APPLICATION OF THIS CLAUSE TO THE PERSONAL LAW OF ANY MUSLIM SECT, THE EXPRESSION "QURAN AND SUNNAH" SHALL MEAN THE QURAN AND SUNNAH AS INTERPRETED BY THAT SECT]

دیکھا آپ نے ہم نے دین ۔ اللہ کے دین کو (کسی انسان کے دین کو نہیں) کس بے باکی اور ڈھٹائی سے پرسنل لاز اور پبلک لاز (مذہب اور سیاست) میں تقسیم کر کے اسے "مذہب" میں تبدیل کر دیا ہے۔ امورِ سیاست، حکومت کی تفویض میں اور امورِ مذہب، مذہبی فرقوں کے علمبرداروں کی تحویل میں۔ آپ سوچئے کہ پبلک لاز اور پرسنل لاز میں تفریق مذہب کی ایجاد ہے یا نظامِ خداوندی کا تقاضا؟ پرسنل لاز اور پبلک لاز کی تفریق کا تصور یکسر خلافِ اسلام ہے۔ دین ایک ایسا نظامِ حیات ہے جس میں عقائد، عبادات، باہمی معاملات، امورِ مملکت، پرسنل لاز اور پبلک لاز وغیرہ سب باہمدگر پیوست۔ بلکہ ایک دوسرے میں مدغم ہوتے ہیں۔ ان میں تفریق شرک ہے۔ دین ایک نظامِ حیات عطا کرتا ہے اور حیات (زندگی) کی صورت یہ ہے کہ وہ ناقابلِ تقسیم وحدت ہے۔ جب دین نظامِ حیات عطا کرتا ہے تو ظاہر ہے اسے بھی مختلف حصّوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ اسے قبول کیا جائے گا تو پورے کا پورا اور مسترد کیا جائے گا تو پورے کا پورا۔ (۲/۲۰۸)

عصرِ حاضر کی اصطلاح میں اس نظام کو، جس میں انسانی زندگی کو دو حصّوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے سیکولر ازم کہا جاتا ہے۔ پاکستان میں ہم نے یہی کیا ہوا ہے۔ ہمارے ہاں درحقیقت سیکولر ازم رائج ہے۔ لیکن ہم کھلے بندوں اس کا نام لینے سے جھجکتے اور جھینپتے ہیں۔ ویسے تو ہماری مملکت "اسلامی جمہوریہ" کہلاتی ہے۔ لیکن عملاً حالت یہ ہے کہ مرکزی حکومت کی مختلف وزارتوں میں، ایک وزارت "امورِ مذہبیہ" کی بھی ہے۔ گویا "مذہبی امور" ان امور سے الگ ہیں جو دیگر وزارتوں سے متعلق ہیں۔ موجودہ (SET UP) مذہبی پیشوائیت کو (SUIT) کرتا ہے کیونکہ وہ "مذہبی آزادی" چاہتی ہے۔ "دین کی آزادی" نہیں تحریکِ پاکستان

کا مقصد کیا تھا اور ہم یہاں کیا کر رہے ہیں!!

لِلّٰہ کچھ تو سوچیے! ان حالات میں افرادِ قوم کا اپنے بنیادی نظریات پر سے یقین اٹھے گا نہیں تو اور کیا ہوگا۔

عزیزانِ من! اس مادہ پرستی اور مفاد پرستی کے دَور میں جب کہ کوئی قدر بھی اپنے مقام پر باقی نہیں رہی۔ ابدی اقدار سے وابستگی اور غیر متبدل اصولِ حیات سے شیفتگی، عام نگاہوں کو تعجب انگیز دکھائی دیتی ہے، کوئی اسے رجعت پسندی قرار دے گا اور کوئی دیوانے کا خواب۔ آپ مجھے چاہے کچھ بھی کہیں میں کہے بغیر نہیں رہونگا کہ پاکستان کی اساس و بنیاد "دو قومی نظریہ اور نظریۂ پاکستان" پر تھی۔ اس لئے

۱ ـــــ جب تک ہمارے آئین میں یہ شق نہ رکھی جائے کہ مسلم اور غیر مسلم ایک قوم قرار نہیں دیئے جاسکتے (یعنی اسلام میں قومیت کا مدار اشتراکِ وطن نہیں بلکہ دین ہے) نہ یہ مملکت اسلامی ہوسکتی ہے۔ نہ ہمارا آئین اسلامی۔ دو قومی قرآنی نظریہ کا عملی مفہوم یہی ہے۔

۲ ـــــ جب تک دو قومی نظریہ کو قرآن حکیم کی روشنی میں ہمارے نصابِ تعلیم میں داخل نہیں کیا جاتا۔ پاکستان کا مستقبل مستحکم نہیں رہ سکتا۔ علامہ اقبالؒ نے فرمایا تھا کہ دو قومی نظریہ کی حقیقت کو وہی سمجھے گا جو اسلام کے اصولوں پر غائر نگاہ رکھتا ہو۔ محض سیاسی عینک سے اس نظریہ کو اس کی اصلی شکل میں نہیں دیکھا جاسکتا۔ اللہ کرے ہمیں ایسا "میرِ کارواں" مل جائے جو قرآنی ذہن رکھتا ہو تاکہ کاروانِ ملت صحیح راستے پر گامزن ہو سکے۔

۳ ـــــ جب تک ہمارے آئین میں یہ شق نہیں رکھی جاتی کہ مسلمانوں میں متعدد قومیتوں کا نظریہ اسلام کی ضد اور مملکت کے خلاف بغاوت کے مرادف ہے، نہ ملتِ واحدہ وجود میں آسکتی ہے نہ پاکستان محفوظ رہ سکتا ہے۔

۴ ـــــ جب تک قوم کو بتایا نہیں جائے گا کہ نظریۂ پاکستان، قرآن کریم کے دو لفظوں میں یہ ہے کہ

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ (۵/۴۸)

"حکومت اللہ کی کتاب کے مطابق قائم کرو"

اور اس پر صدقِ دل سے عمل نہ کیا گیا، تو اوّل تو اس مملکت کی وجہِ جواز ہی ختم ہو جائیگی۔ اور اگر یہ باقی بھی رہے تو یہ اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کا گہوارہ نہیں بن سکے گی جس کے لئے اسے حاصل کیا گیا تھا۔

۵ ـــــ جب تک ہم اس حقیقت کو تسلیم نہیں کرتے کہ ہمارا مروّجہ "اسلام" منزل من اللہ دین نہیں۔ بلکہ انسانوں کا خود ساختہ مذہب ہے۔ ہمارے اندر وہ تغیرِ نفس پیدا نہیں ہو سکتا جو ہمارے

حالات میں انقلاب لاسکتا ہے۔ ایسا تغیّر لائے بغیر ہمارے معاشرے کی حالت نہیں سدھر سکتی۔ چاہے آپ کچھ ہی کرلیں۔

۶ ہمارے مروّجہ مذہب کو پھر سے دین اللہ (اسلام) میں بدلنے کے لئے ہمیں قرآنی دعوت کا دیا جلانا ہوگا اور اس کو دنیاوی اسباب و ذرائع کے تیل سے نہیں بلکہ اپنے خونِ جگر سے جلائے رکھنا ہوگا۔ سفر بڑا کٹھن ہے، راستے میں مذہبی پیشوائیت نے اپنے جال پھیلائے ہوئے ہیں۔ ان سے بچنے اور نکلنے کا واحد اور آسان طریقہ قرآنی طریقہ ہے:۔

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا (۳/۱۰۲)

قرآں میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں
اللہ کرے تجھ کو عطا جدّتِ کردار!

سُن رکھیئے! ہمارے معاشرہ کا سارا بگاڑ اللہ کی مقدّس کتاب کے ساتھ مسلسل کھیل کھیلنے کی بنا پر ہے۔ اگر ہم نے یہ کھیل بند نہ کیا اور رسولؐ اللہ کی سنّت کی پیروی نہ کی اور قرآن اور صرف قرآن کو اپنے آئین کی بنیاد نہ بنایا تو پھر فطرت کے فیصلہ کا انتظار کیجئے! قرآن حکیم نے کہا ہے کہ جب کوئی قوم مہلت کے وقفہ سے فائدہ نہ اٹھائے اور اپنی ذہنیّت نہ بدلے، اپنی روش نہ بدلے تو:۔

يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ (۴۷/۳۸)

"وہ اس قوم کی جگہ کوئی دوسری قوم لے آیا کرتی ہے۔ جو اس جیسی نہیں ہوتی"

یہی وہ اصولِ خداوندی ہے جس سے ہمیں ڈرنا چاہیئے کہ وہ ہمیں مہلت کے وقفے بار بار نہیں دیگا۔

اندازِ بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے
شاید کہ ترے دل میں اُتر جائے مری بات!

در آخر میں میرے ساتھ دعا میں شامل ہو جیئے!

رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۶۶/۸)

اے ہمارے رب! ہمارے نورِ بصیرت کو مکمل کر دے اور زندگی کے ہر قسم کے خطرات سے ہمیں محفوظ رکھ! بے شک یہاں ہر بات تیرے قائم کردہ قوانین کے مطابق واقع ہوتی ہے

والسّلام

اعزاز الدین احمد خان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ثریا عندلیب

السّلام علیکم!

قارئینِ محترم! السّلام علیکم ——— آپ پر سلامتی ہو ——— میں آپ ہی سے مخاطب ہوں۔ آپ ہی کو امن و سلامتی کا پیغام دے رہی ہوں اور پھر یہ کوئی نئی بات تو ہے نہیں جو کہ میں آپ سے کہہ رہی ہوں۔ یہ دعا یہ خواہش یہ تمنا تو ہماری روزمرّہ زندگی کا معمول بن چکی ہے۔ ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو بھی امن و سلامتی چاہتے ہیں۔ جدا ہوتے ہیں تو بھی اسی خواہش کے ساتھ۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ معاشرہ، ان حالات میں جنّت بداماں ہوتا، جس میں نہ خوف ہوتا نہ حزن، لیکن باوجود اس کے کہ ہمارے ہاں جہاں ہر طرف 'السّلام علیکم' کی صدائیں گونجتی سنائی دیتی ہیں، کوئی فرد دوسرے فرد کی دست بُرد سے محفوظ نہیں۔ پڑوسی پڑوسی کا دشمن ہے۔ بھائی بھائی کا گلا کاٹ رہا ہے۔ نہ کہیں امن ہے نہ سکون۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ 'السّلام علیکم' کی اصطلاح اپنا اثر کھو چکی ہے یا یہ بھی اسلام کی دوسری اصطلاحات کی طرح غلط معانی کا شکار ہو چکی ہے۔

آیئے!! کچھ دیر کے لئے اس اصطلاح کی کہنہ و ماہیت پر غور کریں

——— لفظ اسلام کا مادہ س ل م ہے جو مختلف شکلوں میں کئی معانی رکھتا ہے۔ یعنی یہ کہ ہر قسم کے عیوب و نقائص سے پاک و صاف ہو جانا۔ اس طرح مکمل ہو جانا کہ کوئی کمی باقی نہ رہے۔ ہر قسم کے خطرات، آفات و حوادث سے محفوظ رہنا۔ سلامتی حاصل کرنا اور دوسرے کو سلامتی عطا کرنا۔ یہ ہے اُسلام، جس کو ہمیں 'السلام علیکم' کے ذریعے دنیا کے سامنے پیش کرنے کا موقع ہر وقت نصیب رہتا ہے بشرطیکہ ہم اپنے معاشرے میں 'السلام علیکم' پر عملاً کاربند رہ کر دنیا کے سامنے مثال بنتے رہیں۔

بلاشُبہ اسلام امن و سلامتی کا دین ہے اور اس پر ایمان رکھنے والا یعنی مومن دنیا میں امن قائم رکھنے کا ذمّہ دار ہے۔ مومن لفظ کے بنیادی معنی ہیں۔ امن کی ضمانت دینے والا۔ جس پر بھروسا کر کے انسان بے فکر اور محفوظ ہو جائے۔ اس نسبت سے ذرا سوچیئے کہ السّلام علیکم کہنے والا مومن معاشرہ کو

تحفظ کی کتنی بڑی ضمانت دے رہا ہوتا ہے، مگر بات تو سوچنے اور عمل کرنے کی ہے۔

قرآن نے خدا کو اَلْمُؤْمِنُ کہا ہے کیونکہ وہ تمام کائنات کی حفاظت کا ذمہ دار ہے اور جو اس کے قانون پر بھروسا کرتا ہے وہ اسے تخریبی قوتوں کی تباہیوں سے محفوظ رکھتا ہے۔ اس اعتبار سے بندۂ مومن وہ ہوگا جس پر تمام انسان اعتماد اور بھروسا کر سکیں۔ اور جو تمام دنیا میں امن قائم رکھنے کا ذمہ دار ہو۔ قرآن میں لفظ امن اعتماد اور بھروسا کے معنوں میں کئی مقامات پر آیا ہے۔ مثلاً سورۃ بقرہ میں لین دین کے معاملات کے ضمن میں فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا (۲:۲۸۳) اگر تم میں سے ایک دوسرے پر اعتماد کرلے۔ اسی طرح سورۃ یوسف کی آیت ۱۱ اور ۶۴ میں یہ بھروسا اور اعتبار کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

اب آیئے! ہم وابستگانِ السلام علیکم دینِ اسلام کو امن اور سلامتی کے حوالے سے سمجھیں اور قرآن کریم نے اس کی جو تشریح و توضیح پیش کی ہے اور جو حقائق پیش کئے ہیں۔ ان کو اپنے دامنِ عمل سے باندھ کر اپنے معاشرہ کو امن و سلامتی کا گہوارہ بنانے میں اپنا کردار ادا کریں۔ اس سلسلہ میں لفظ الدین اور الاسلام کو دیکھئے۔ جس طرح کائنات کی ہر شئے کے لئے ربّ العالمین نے قوانین متعین کئے ہیں اسی طرح اس نے انسانی زندگی کے لئے بھی مستقل قوانین عطا کئے ہیں۔ اس ضابطۂ قوانین کو الدین کہا گیا ہے۔ اور وہ طریق جس کے مطابق انسان اس ضابطۂ قوانین کو عملاً اختیار کرتا ہے الاسلام کہلاتا ہے اور اس طریق کو اختیار کرنے والے مسلم کہلاتے ہیں، یعنی وہ جو قوانینِ خداوندی کی اطاعت سے اپنی نشوونما کئے جاتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں خود بھی امن و سلامتی میں رہتے ہیں اور ساری دنیا کو بھی امن و سلامتی کی ضمانت دیتے ہیں۔

سورۃ بقرہ اور سورۃ آل عمران میں بتایا گیا ہے کہ اسلامی نظام کا مرکز تمام عالم انسانیت کے لئے امن کا موجب ہوگا۔ اس میں سامانِ زیست کی فراوانیاں ہونگی۔ اس نظام کا قیام تمام نوعِ انسانی کی بھلائی کے لئے ہوگا۔ اس لئے جماعتِ مومنین کا یہ فریضہ قرار دیا گیا ہے کہ وہ تمام نوعِ انسان کو خیر کی طرف دعوت دے۔ ــــ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی پابند ہو یعنی ان امور کو عملاً نافذ کرے جنہیں سرچشمۂ خیر قرآن صحیح تسلیم کرتا ہے اور ان سے روکے جو قرآن کے نزدیک ناپسندیدہ ہیں۔ سعی و عمل کی کھیتیاں پروان چڑھنے اور زندگی کو حقیقتاً کامیاب بنانے کا یہی طریقہ ہے۔ (۳:۱۰۳) قرآن کریم نے امّتِ مسلمہ کو بہترین قوم بنایا ہے تو کیوں؟ تاکہ وہ ایسا نظام قائم کرے جو عالمگیر انسانیت کے لئے نفع رساں ہو امن و سلامتی کا پیامبر۔ نہ صرف امّتِ خیر بلکہ بین الاقوامی پولیشن کی حامل جسے دنیا کی ہر قوم کو یکساں فاصلے پر رکھنا

ہوگا۔ وہ نہ کسی کی طرف جھکی ہوگی نہ کسی سے کھنچی ہوگی۔ تمام اقوامِ عالم کے اعمال کی محاسب و نگران تاکہ وہ دیکھے کہ کوئی قوم ظلم اور زیادتی پر تو نہیں اتر آئی۔ اور خود یہ قوم اللہ و رسول کی اطاعت گذار یعنی ہر سائنس میں قوانینِ خداوندی کی پیروی کرنے والی۔ یہ ہے اللہ تعالیٰ کی آخری کتابِ مبین قرآنِ کریم کی ابدی روشنی میں امن کے امین دینِ اسلام اور اس کی تابع امتِ مسلمہ کا تعارف۔

کیا ہم السّلام علیکم کہنے والے موجودہ مسلمانوں کا بھی یہی تعارف ہے؟ بجائے اس کے ہم نے تو السلام علیکم کو اس میں پوشیدہ امن و سلامتی کی حسین آرزو سے ہی بے دخل کر رکھا ہے۔ امن و سلامتی کی فضاء پیدا ہو تو کیسے؟ یوں تو دنیا میں کوئی ایک انسان ایسا نہ ہوگا جو امن چین کی زندگی کی خواہش نہ رکھتا ہو لیکن اس حقیقت کو بھی جھٹلایا نہیں جا سکتا کہ دنیا کا کوئی فرد۔ کوئی گروہ کوئی جماعت کوئی قوم ایسی ملنی محال ہے جسے امن و سلامتی کا پاکیزہ ماحول میسّر ہو۔ اس کی وجوہات کچھ بھی ہوں لیکن انسان کو اللہ تعالےٰ نے ایسی صلاحیتوں سے نوازا ہے کہ جن کو بروئے کار لا کر وہ ہر مشکل پر غالب آسکتا ہے اور دنیا کے فساد و خلفشار کو امن و سلامتی میں بدل سکتا ہے چونکہ اللہ نے امتِ مسلمہ پر تمام اقوامِ عالم کی نگرانی کی اہم ترین ذمہ داری ڈالی ہے اس لئے امن و سلامتی قائم کرنے اور برقرار رکھنے میں امتِ مسلمہ ہی کا کردار سرِفہرست رہے گا۔

میرا موضوعِ سخن السّلام علیکم ہے جو امتِ مسلمہ سے بنیادی تعلق رکھتا ہے جو اس قدر اہم ہے کہ اگر اس کے مفہوم کو پیشِ نظر رکھ کر اسے استعمال میں لایا جائے تو یہ دین اسلام کا نقیب بن کر زمین و آسمان بدل ڈالے۔ آج اس حقیقت کو سمجھ لینے کی اوّلین ضرورت ہے۔

آئیے!! مل کر السّلام علیکم کی سچائی سے معاشرے میں امن و سلامتی کے پھول کھلائیں۔

کثرت و قلّت

مغربی نظامِ جمہوریت کی بنیادی خرابی یہ ہے کہ اس میں صحیح اور غلط (یعنی حق و باطل) کا معیار لوگوں کی کثرت و قلّت ہے۔ صحیح وہ ہے جس کی تائید میں اکیاون ہاتھ اٹھیں۔ قرآن کی رو سے یہ معیار یکسر غلط ہے اور باطل ہے۔ اس کے نزدیک حق، حق ہے خواہ اس کی تائید میں ایک ہاتھ بھی نہ اٹھے اور باطل، باطل ہے خواہ اس کے حق میں سو فیصد آراء ہوں اس کا مطلب یہ ہے کہ وحی کی رو سے حق اور باطل، خیر اور شر مطلق ABSOLUTE ہوتا ہے، اضافی RELATIVE نہیں ہوتا، یہی فرق دینی مملکت اور سیکولر سٹیٹ میں ہے ــــ قرآن کی رو سے صرف تعداد کی کثرت کامیابی کیلئے فیصلہ کن نہیں۔ جوہرِ ذاتی، صلاحیتِ کبریٰ اور بلندیٔ کردار تعداد کی کمی کا ازالہ کر دیتی ہے۔ ویسے جماعت کی کثرت بھی خدا کی نعمت ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مس ریحانہ فردوس
(ایم۔اے سیاسیات)

رونا چھوڑیئے ۔۔۔ جینا شروع کیجئے!

یہ بات کس قدر مضحکہ خیز ہے کہ ہم انسانوں کی زندگی کا بیشتر حصہ، ان مسائل کی نذر ہو جاتا ہے جو، یا تو سرے سے مسائل ہی نہیں ہوتے یا ان مسائل کا براہ راست ہم سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ذرا غور سے دیکھیں اور پرکھیں تو اس سے بھی زیادہ دلچسپ اور مضحکہ خیز یہ حقیقت نظر آئے گی کہ ہمارے اکثر و بیشتر مسائل "حقیقی" نہیں ہوتے بلکہ ہمارے اپنے ہی ذہنوں کی پیداوار ہوتے ہیں۔ انہیں ہم خود تخلیق کرتے ہیں۔ اپنی ذات اور شخصیت کے اردگرد خود ہی ان مسائل کا تانا بانا بُنتے ہیں اور زندگی بھر خود ہی ان میں گرفتار رہ کر چیختے چلاتے رہتے ہیں ۔۔۔ تقدیر کو کوستے ہیں، اپنوں کی بے حسی اور عدم التفات کا رونا روتے ہیں اور یونہی لڑتے جھگڑتے روتے دھوتے اس دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں ۔۔۔ آپ سوچیں گے بھلا یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟ کوئی بھی صحیح الدماغ انسان کسی مفروضے پر ۔۔۔ کسی وہم و گمان پر اپنی زندگی داؤ پر نہیں لگا سکتا، خود کو ہلاک نہیں کر سکتا۔ یقیناً نہیں کر سکتا۔ مگر ہم کر رہے ہیں۔ کرتے چلے آ رہے ہیں اور کرتے چلے جا رہے ہیں۔

ہوتا یوں ہے کہ جب ہم کسی غلط بات، وہم، گمان یا روش کو بار بار دہراتے ہیں۔ اٹھتے بیٹھتے اس کا حوالہ دیتے ہیں، بحثیں کرتے ہیں، اس کے سچ ہونے کا دوسروں کو یقین دلاتے ہیں تو وہی غلط بات آہستہ آہستہ ہمارے اپنے ذہنوں میں بھی پختہ ہونی شروع ہو جاتی ہے اور ہمارا شعور بھی اسے تسلیم کرنے لگتا ہے۔ غلط کو صحیح سمجھنے لگتا ہے اور ہم اس یقین کے باوجود کہ یہ غلط ہے۔ وہم ہے۔ خیالِ محض ہے۔ آہستہ آہستہ شعوری طور پر اسے خود بھی تسلیم کر لیتے ہیں ۔۔۔ میکیاولی کے قول کے مطابق "جھوٹ کو پورے اعتماد اور ثبت سے بار بار بولا جائے تو وہ کچھ عرصہ بعد "سچ" بن جاتا ہے اور افراد ہی نہیں قومیں بھی اس کی "سچائی" پر ایمان لے آتی ہیں"۔

آپ نے اکثر دیکھا ہوگا کہ بعض بچے، مرد اور عورتیں دوسروں کی توجہ حاصل کرنے کے لئے اکثر کسی فرضی دکھ یا درد کا بہانہ بناتے ہیں اور پھر ایک ہی بہانے کو مسلسل دُہراتے رہنے کی وجہ سے وہ دکھ یا درد سچ مچ

ان کے لئے حقیقت کا رُوپ دھار لیتا ہے ـــــ وہ فی الواقعہ درد سے تڑپتے اور چیختے چلاتے نظر آتے ہیں اور مستقلاً اسی روگ میں مبتلا ہو جاتے ہیں ـــــ ایسے مریض پھر کسی دوا سے بھی ٹھیک نہیں کئے جا سکتے۔ ان کا نفسیاتی علاج کرانا پڑتا ہے۔ انہیں نفسیاتی مریض ہی قرار دیا جاتا ہے ـــــ گویا جو پہلے بہانہ تھا۔ محض جھوٹ تھا۔ اپنے ذہن کا تراشا ہوا فرضی دکھ تھا۔ کثرت سے اس کا ذکر اور اعادہ کرتے رہنے سے خود اپنا ہی شعور اس پر ایمان لے آیا، سچ سمجھنے لگا اور پھر اس کے اثرات اپنے جسم اور مزاج پر بھی بعینہٖ وہی مرتب ہونے لگے جو وہ دوسروں پر مرتب کرنا چاہتا تھا۔

آپ نے ایک لفظ سنا ہوگا "برین واشنگ" ہر چند کہ یہ اصطلاح اسی صدی میں رائج ہوئی ہے لیکن اس کا مفہوم بھی وہی ہے کہ غلط یا صحیح، اپنے نظریات و خیالات کو دوسروں تک متواتر اور مسلسل ایسے انداز سے پہنچانا کہ سننے والا انکو حق اور سچ تسلیم کرلے اور ان پر ایمان لے آئے۔

اپنی برین واشنگ انسان خود بھی کرتا ہے۔ کوئی دوست یا کوئی شخص اچھا لگتا ہے۔ اس کا چہرہ یا انداز گفتگو بھلا معلوم ہوتا ہے اور ہم فیصلہ کر لیتے ہیں کہ وہ ہر اعتبار سے "اچھا" ہے ـــــ پھر اپنا یہی فیصلہ دہراتے چلے جاتے ہیں، یہاں تک کہ شعور بھی اس فیصلے کو تسلیم کر لیتا ہے۔ اب کوئی لاکھ کہے کہ وہ اچھا نہیں ہے، ہم نہیں مانتے ـــــ لڑتے ہیں، روتے ہیں ـــــ اس کی دوستی کے لئے جہاں بھر سے دشمنی مول لیتے ہیں۔ والدین، عزیز و اقارب تک کو چھوڑ دیتے ہیں ـــــ مخالفت بڑھ جائے تو خودکشی بھی کر لیتے ہیں ـــــ جان تک دے دیتے ہیں ـــــ یوں بھی ہوتا ہے کہ وہی دوست اگر فی الواقعہ بُرا نکلے اور ہم پر اس کی برائی ظاہر بھی ہو جائے تو یہ کہہ کر گزر جاتے ہیں کہ

ع آسمانوں سے بھی پایا ہے اُسے میں نے بلند
وہ بُرا ہے بھی تو پھر ہوگا زمانے کے لئے

اس سے کچھ اور آگے بڑھئے تو عقائد و نظریات کی منزل آتی ہے۔ اسلاف پرستی اور روایت پرستی کی منزل آتی ہے ـــــ کسی مزار، کسی پیر فقیر، کسی بزرگ کے متعلق بڑوں سے مسلسل سنا کہ وہ "ولی" ہیں۔ صاحبِ کرامت ہیں ـــــ یا ہم نے اپنے بڑوں کو کسی کے سامنے مسلسل جھکتے، تعظیم کرتے دیکھا اور خود بھی ذہنی طور پر اس کی عظمت اور بزرگی کو تسلیم کرتے چلے گئے۔ اس کی کرامتوں کو صحیح سمجھنے لگے اور اپنے ملنے جلنے والوں میں وثوق کے ساتھ یقین کے ساتھ یہی کرامتیں خود بھی دہرانے لگے ـــــ فلاں

کے عمل سے بگڑی بن جانے کا تجربہ خود ہم نے کیا ہے۔ فلاں کالے علم کا ماہر ہے۔ فلاں کے قبضہ میں جن ہے، ہمزاد ہے، موکل ہے ——— آپ لاکھ دلیلیں دے لیجئے، عقیدے کی چٹان کو جنبش نہیں دے سکتے، جواب ملے گا:

"ہم کیسے مان لیں ہم نے اپنی آنکھوں سے یہ سب ہوتے دیکھا ہے"

اور بے شک ہوتا بھی ایسا ہی ہے ——— ابھی عرض کیا ہے نا کہ آپ کسی بات کو دہراتے رہیے تو وہ غلط بھی ہو تو صحیح نظر آنے لگے گی ——— اور تو اور آپ پتھر سے عقیدت پیدا کر کے دیکھ لیجئے۔ اسے حاجت روا بنا کر دیکھ لیجئے۔ آپ کو اپنی زندگی کی ہر تبدیلی، اسی پتھر کی کرامت محسوس ہونے لگے گی۔

اور آگے چلئے تو مذہبی عقیدے ہیں ——— ہر عقیدے کے لوگ خود کو صحیح اور دوسروں کو غلط سمجھتے ہیں اور اپنے صحیح ہونے کی دلیل اُن کے پاس وہ روایات اور واقعات ہوتے ہیں جو بچپن سے سماعت ان کے کانوں میں پڑتے رہے ہوتے ہیں اور ساری عمر کسی نے کبھی ان پر غور و فکر نہیں کیا ہوتا۔ بس جو جس گھرانے میں پیدا ہو گیا اسی گھرانے کا عقیدہ اس کا ایمان بن گیا اور باقی دنیا کے عقیدے کفر قرار پا گئے ——

ہماری ساری زندگی اور زندگی کے سارے مسائل و عوامل کا محور یہی مفروضات ہیں یہی توہمات اور نظریات ہیں اور یہی اسلاف کے خود ساختہ عقائد ہیں۔ یقین کر لیجئے کہ یہ سب اپنے اور اپنے آباؤ اجداد کے خود تراشیدہ افسانے ہیں۔ حقیقت سے ان کا دُور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ سینکڑوں سال سے ان واقعات کو، ان عقیدوں اور نظریوں کو پورے تواتر اور تسلسل کے ساتھ اس قدر دہرایا گیا ہے اور اس حد تک ہمارے برین واشنگ کر دی گئی ہے کہ ہم یہ سوچنا بھی گناہ سمجھتے ہیں کہ اس میں ذرہ برابر بھی کچھ غلط ہو سکتا ہے بلکہ اب تو کیفیت یہ ہو گئی ہے کہ غلط کو غلط سمجھنے کے بجائے، غلط کو صحیح سمجھنے اور سمجھانے کے لئے انسانیت کی حدود سے بھی گزر جانا پڑے تو گزر جاتے ہیں۔ احادیثِ مکرم اور قرآنِ معظم کی بنیادی تعلیمات اور مفہوم کو بھی اپنے نظریات کے مطابق ڈھالنے کی جرأت کر لیتے ہیں اور اس خود فریبی میں جیئے چلے جاتے ہیں کہ ہم صراطِ مستقیم پر چل رہے ہیں۔ ہم ہی صحیح ہیں باقی سب غلط ہیں۔

آج تک ہم نے جو پڑھا، جو سُنا کیا کبھی اس پر غور کیا؟ ہر گھر میں قرآن موجود ہے۔ ہم نے اپنے عقائد و نظریات کو اس کی کسوٹی پر پرکھا؟ کبھی یہ جاننے کی کوشش کی کہ قرآن کا نام لے کر، اللہ اور رسولؐ کا نام لے کر جو کچھ ہمیں بتایا جاتا ہے۔ کیا واقعی وہ قرآن میں کہیں موجود و مذکور ہے؟ مجھے یقین ہے کہ اکثریت کا جواب نفی میں ہو گا ——— ضرورت ہی سمجھی نہیں ہو گی تصدیق کی ——— اور ضرورت اس لئے نہیں سمجھی ہو گی کہ

جو کچھ ہمیں ملا ہے، اب وہی ہمارا دین ایمان ہے اور اس میں ذرا سا بھی شک کرنا کفر ہے۔ ایمان کیخلاف بغاوت ہے۔ اب اگر کوئی آنکھوں سے بھی حقیقت کو دکھا دے تو ہم نہیں مانیں گے کہ صاحب بات لاکھ درست سہی مگر پرنالہ وہیں رہے گا۔

ربِّ کائنات کا تو پہلا اعلان ہی یہ ہے کہ اور تو اور اگر قرآن بھی تمہارے سامنے پیش کیا جائے تو اسے بھی عقل کی کسوٹی پر پرکھ کر قبول کرو غور و فکر کرو۔ سوجھ بوجھ سے کام لو:۔

وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا ۝ (۲۵:۷۳)

یہاں تک کہ جب ان کے سامنے اللہ کی آیتیں بھی پیش کی جائیں تو وہ ایسا نہیں کرتے کہ عقل و فکر کو بالائے طاق رکھ کر اندھوں بہروں کی طرح انہیں اختیار کر لیں۔

اتنی واضح اور اتنی غیر مبہم حقیقت سامنے آجانے کے بعد بھی ہم اپنے ذہنوں پر لگے ہوئے زنگ آلود تالے کھولتے ہوئے کیوں ہچکچاتے ہیں۔ کیوں نہیں سوچتے کہ ہزاروں لاکھوں سال سے مردے ہم سے جو کہانیاں منسوب کر رکھی ہیں، از خود ہماری زندگی کا جو مقصد اور مقام متعین کر رکھا ہے اور ہمیں جس "ایمان" پر پکا اور پختہ کر دیا ہے وہ اللہ کا دیا ہوا نہیں ہے۔ ان میں سے کوئی ایک بات بھی قرآن کے اندر موجود نہیں ہے۔ سب مردے کے اپنے ذہن کی تراشیدہ ہیں۔ اس کی اپنی خواہشات کا عکس ہے جسے صحیح ثابت کرنے کے لئے مردے نے قرآن پر بہتان لگانے سے بھی گریز نہیں کیا۔ اللہ اور رسولؐ کو بھی نہیں چھوڑا اور کئی صدیوں تک ہماری اس طرح برین واشنگ کی کہ اب مردوں کا یہی جھوٹ، یہی بہتان اور یہی مکر و فریب ہمارا "مذہب" بن گیا ہے اور ہم اسی کو اپنی نجات کا ذریعہ سمجھے بیٹھے ہیں۔

آپ یہ مت سمجھ لیجئے کہ میں یہ سب یونہی کہہ رہی ہوں۔ نہیں! اس کے لئے اللہ اور رسولؐ کی گواہی میرے ساتھ ہے، قرآن میرے ساتھ ہے اور آج اپنے دعوے کی تائید میں یہی سب لے کر آپ کے پاس آئی ہوں۔ غور کیجئے قرآن سے تصدیق کیجئے اور دیکھئے کہ جو باتیں سرے سے قرآنِ کریم میں موجود ہی نہیں ہیں کس طرح جزو ایمان بنا دی گئی ہیں۔ پہلی مثال یہی لے لیجئے کہ:

• ——— عورت آدمی سے پیدا کی گئی ہے۔ یعنی اماں حوا آدم کی پسلی سے پیدا کی گئی تھیں۔

یہ بات سارے قرآن میں اکسی ایک جگہ بھی درج نہیں ہے لیکن ہمارے ایمان کا حصہ ہے۔ ستم تو یہ ہے کہ یہ واقعہ نہ قرآنِ کریم میں مذکور ہے نہ اللہ نے کہا ہے لیکن اس من گھڑت واقعہ کی تائید میں

رسولِ محترم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس کو بھی ملوّث کر دیا گیا ہے۔ ان سے بھی یہ حدیث منسوب کر دی گئی ہے کہ:

"عورت آدم کی پسلی سے پیدا کی گئی ہے اور سب سے بلند پسلی سب سے زیادہ ٹیڑھی ہوتی ہے۔ پس تو اگر اسے سیدھی کرنے کی کوشش کرے گا تو اسے توڑ دے گا اور اگر اس میں کچھ کجی باقی چھوڑتے ہوئے فائدہ اٹھانا چاہے تو بے شک فائدہ اٹھا سکتا ہے۔"

گویا عورت آدم ہی سے پیدا نہیں کی گئی بلکہ اس کا مقام بھی متعین کر دیا گیا ہے کہ وہ ٹیڑھی ہوتی ہے اور صرف مرد کے فائدہ اٹھانے کے لئے پیدا کی گئی ــــــ اور معاذ اللہ معاذ اللہ اسے فرمودہ قرار دیا گیا اللہ کے پیغمبر رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا۔

ــــــ اس طرح آپ نے یہ بھی سنا ہوگا کہ اماں حوا نے آدم کو بہکایا اور جنت سے نکلوایا اور اس من گھڑت بات کو اس قدر دہرایا گیا کہ عورت مسلّمہ مجرم بن گئی۔ گناہ گار ٹھہری۔ قابلِ نفرت گردانی گئی حالانکہ قرآن نے کہا:

فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ۔ (۲:۳۶)

مرد اور عورت دونوں کو بہکانے والا شیطان تھا۔

کیا قیامت ہے کہ اللہ تو کہہ رہا ہے کہ بہکانے والا شیطان ہے اور شیطان کی سازش کا شکار عورت اور مرد دونوں ہوئے تھے لیکن ہمارے ذہنوں پر نقش کیا جا رہا ہے کہ آدم کو بہکانے والی عورت تھی اور آدم عورت کی سازش کا شکار ہوئے تھے۔

ــــــ آپ نے یہ بھی سنا ہوگا کہ "مرد بیویوں پر حاکم ہیں۔ داروغہ ہیں" اور اس کی تائید میں سورۃ النساء کی آیت (۴:۳۴) بھی آپ کے سامنے پیش کی گئی ہوگی ــــــ اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ جسے بیویوں کو مارنے پیٹنے کے جواز میں پیش کیا جاتا ہے ــــــ اولاً اسے معمولی سے غور کے بعد ہی آپ حیران رہ جائیں گے کہ اس آیت میں کہیں بھی شوہر بیوی کا ذکر نہیں ہے۔ اَلرِّجَال کے معنی دنیا کی کسی بھی لغت میں شوہر کے ہیں ہی نہیں اور نہ قَوَّامُوْن کے معنی "داروغہ اور حاکم" ہوتے ہیں اور نہ النِّسَآء کا مطلب "بیوی" ہوتا ہے۔ شوہر اور بیوی کے لئے قرآن نے "زوج" کا لفظ استعمال کیا ہے "الرجال" عام مردوں کے لئے اور "النساء" عام عورتوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اس آیت کے پورے مفہوم کو سامنے رکھئے اور دیکھئے کہ بات عام مردوں اور عام عورتوں کی ہو رہی ہے، اور بتایا یہ جا رہا ہے کہ انسانی معاشرہ میں، عام مردوں اور عام عورتوں کے فرائض کیا ہونے چاہئیں ــــــ قرآن کریم نے عورتوں اور مردوں میں کام کی تقسیم اس طرح کی ہے کہ مرد اپنی ساخت اور ہیئت کے اعتبار سے اکتسابِ رزق کے

لیئے زیادہ موزوں ہیں اور عورتوں کو دوسرے کاموں کی استعداد مردوں کے مقابلہ میں زیادہ عطا کی گئی ہے ۔ لہٰذا وہ دوسری ذمہ داریاں سنبھال لیں۔ اس طرح معاشرہ میں توازن اور حسن قائم ہو جائے گا۔ اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَاءِ ۔یعنی مرد عورتوں کے معاشی کفیل بن جائیں اور حصولِ رزق میں جو وقت مردوں کو خرچ کرنا پڑے گا اور تکمیلِ ذات کیلئے جن امور پر وہ توجہ نہیں دے سکیں گے، اُن امور کی ذمہ داری عورتیں سنبھال لیں۔ اس طرح دونوں کی صلاحیتوں کی نشوونما بھی ہو جائے گی اور دونوں کی ذات کی تکمیل بھی ہو جائے گی ـــــ علاوہ ازیں "پردے" کی بات ہو یا تحفظِ عصمت کی۔ زیب و زینت کی بات ہو یا فیشن کی۔ ایک سے زیادہ شادیوں کا ذکر ہو یا نابالغوں کی شادیوں کا اور یا تین طلاق یا عدت کا ہر جگہ اور ہر مقام پر قرآن کے احکامات اور انکی تفسیر میں دن اور رات کا فرق نظر آتا ہے۔ اللہ کچھ کہتا ہے اور مرد کا ظالم سماج کچھ تفسیر پیش کرتا ہے۔ جی چاہتا ہے ایک ایک مقام، ایک ایک موڑ، ایک ایک موضوع سے گزروں لیکن وقت بھی محدود ہے اور سچ پوچھیئے تو جان بھی عزیز ہے۔ ملاقات رہی تو یہ مواقع آتے ہی رہیں گے ـــــ آج صرف اتنی گزارش ہے کہ جو کچھ ہوتا آرہا ہے اس پر خود بھی غور کر لیجئے اسے قرآن کی کسوٹی پر پرکھ لیجئے ـــــ روایات پر سر دھننے کی بجائے قرآن کو پڑھیے سمجھیے ـــــ اپنے مقام کو جانیئے پہچانیئے ـــــ اپنے حقوق سے آگاہی حاصل کیجئے ـــــ کسی کو دوش مت دیجئے قسمت کو نہ کوسئے ـــــ شب و روز رونا چھوڑ یئے ـــــ قرآن کریم کی دی ہوئی آزادی کی کھلی اور روشن فضا میں سانس لینا شروع کیجئے اور جان لیجئے! یقین کر لیجئے کہ اطاعت اور فرمانبرداری صرف اور صرف اللہ کے قانون ہی کی ہے۔ کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ دوسرے انسان سے اپنی اطاعت کرلے یا اُسے اپنے سے کم تر اور کم عقل سمجھے یہی لا الٰہ الا اللہ کا مفہوم ہے اور یہی دینِ اسلام کا تقاضا ہے۔

انسانی زندگی

قرآنِ کریم انسانی زندگی کو بڑا SERIOUSLY لیتا ہے۔ اس کے نزدیک اس کا ایک ایک لمحہ اس طرح قیمتی ہوتا ہے جس طرح کسان کا فصل بونے کا موسم۔ اسے SERIOUSLY نہ لینا اور بے معنی اور بیہودہ باتوں میں ضائع کر دینا، انسانیت کی عدالت میں جرم ہے اور فردِ متعلقہ کیلئے بہت بڑے خسارے کا موجب۔ اس لئے اس سے اجتناب ضروری ہے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جسٹس (ریٹائرڈ) خلیل الرحمٰن چوہدری

وقت کے اہم ملی تقاضے اور ملکی قانون

(نیشنل اور صوبائی اسمبلیاں تحلیل ہو چکی ہیں۔ فیڈرل اور صوبائی حکومتیں بھی کالعدم قرار پا چکی ہیں۔ تاہم اس مضمون کی تکمیل جس وقت ہوئی اُس وقت نہ نیشنل اور صوبائی اسمبلیاں تحلیل ہوئی تھیں اور نہ ہی فیڈرل اور صوبائی حکومتیں توڑی گئی تھیں۔ باوجود آنکہ اس مضمون میں اٹھائے گئے نکات چونکہ خاص بنیادی اہمیت کے حامل ہیں اس لئے مضمون اسی حالت میں، جس میں تکمیل کیا گیا اشاعت کے لئے ارسال ہے۔ تاہم قارئین حالیہ تبدیلیوں کو ملحوظ خاطر رکھیں۔

اس امر میں کسی اختلاف کی گنجائش نہیں کہ پارلیمانی جمہوری نظام میں مختلف سیاسی جماعتیں وجود میں آتی ہیں اور ہر جماعت اپنے منشور کی روشنی میں اور اپنی کارکردگی کی بنا پر الیکشن کے دوران اپنے آپ کو قوم کے سامنے پیش کرتی ہے۔ نتیجۃً اکثریتی پارٹی کو حکومت تشکیل دینے کا حق حاصل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح یہ بات بھی مسلّمہ ہے کہ فیڈرل نظامِ حکومت میں مرکز میں اگر ایک جماعت نے حکومت تشکیل دی تو کسی ایک اکائی یا ایک سے زیادہ اکائیوں میں کسی دیگر جماعت یا جماعتوں نے اکثریت حاصل کی۔

ہمارے ہاں ۱۹۸۸ء کے عام انتخابات میں بھی مرکز اور دو صوبوں میں ایک سیاسی جماعت اور باقی ماندہ دو صوبوں میں دیگر سیاسی جماعتیں کامیاب ٹھہریں۔

مزید یہ کہ حکمران جماعت کو حق ہے کہ وہ اپنے دورِ حکومت میں اپنے منشور کی ترویج کے لئے ایسے اقدامات اٹھائے، جن سے عوام کے دلوں میں اس کا وقار بڑھے۔ یہ سب کچھ اس حقیقت کے پیشِ نظر ضروری ہے کہ جمہوری نظام میں بار بار عوام کے پاس جانا اس نظام کی بنیاد ہے۔ تاہم ہمارے معاشرہ میں حکمران سیاسی جماعتوں نے اس سیدھے سادھے نظام کو اس طور الجھایا ہے کہ اس کی افادیت مشکوک ہونے لگی ہے۔ صوبائی حکومتیں جہاں اپوزیشن برسرِ اقتدار ہے۔ اور مرکز کے درمیان محاذ آرائی کی سی کیفیت طاری ہے، ہر ایک دوسرے کی حکومت کے خاتمے کے سوا کسی اور بات پر متفق ہوتا نظر نہیں آتا۔ الزامات اور جوابی الزامات کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ جاری ہے۔ ایک طرف سے کہا جا رہا ہے کہ اٹھارہ ماہ کی قلیل مدت میں ہم نے

ملک کا معاشی نظام اس طور بدل ڈالا ہے کہ عوام معاشی دشواریوں سے نجات پا چکے ہیں۔ دوسری طرف سے کہا جاتا ہے کہ بڑھتی ہوئی مہنگائی نے عام انسان کی کمر توڑ کر رکھ دی ہے۔ اور اس ضمن میں پٹرول، بجلی، کھاد کی قیمتوں میں اضافہ۔ موجودہ بجٹ میں نئے ٹیکسوں کے نفاذ کا ذکر ہو رہا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ حکمران جماعتیں بیوروکریٹس کو سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کر رہی ہیں۔ یہاں تک کہ ان کو اپوزیشن کے ارکان پر نہ صرف غیر قانونی اور غیر آئینی دباؤ ڈالنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے بلکہ مخالفین اور ان کے رشتہ داروں کو جھوٹے مقدمات میں ملوث کرنے سے بھی گریز نہیں کیا جاتا۔ یہ بات اکثر زیر موضوع رہتی ہے کہ ملازمتوں کا حصول سیاسی وابستگی کے بغیر ممکن نہیں رہا۔ اور اس ضمن میں نہ صرف قواعد و ضوابط کو اکثر نظر انداز کیا جاتا ہے بلکہ اہلیت کی پرواہ کئے بغیر ملازمتیں دی جا رہی ہیں جس سے انتظامیہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اب تو بات یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ حکومتوں کے دہشت گردی میں ملوث ہونے کے الزامات بلا کم و کاست لگائے جا رہے ہیں۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ دہشت گردی کے اس دور میں سینکڑوں معصوم لوگوں کی زندگیاں تلف ہو چکی ہیں۔ بچے یتیم اور اس ملک کی بیٹیوں کو بیوگی کی چادر اوڑھا دی گئی۔ اگر مؤخر الذکر الزام میں ذرہ برابر بھی سچائی ہے تو یہ ہمارے لئے ڈوب مرنے کا مقام ہے۔

ان چند ابتدائی کلمات کو اپنی طرف سے اور کچھ کہے بغیر میں قرآن کریم کی ایک آیت اور اس کی تشریح میں مولانا مودودی کے چند الفاظ پیش کر کے ختم کرتا ہوں۔

سورہ اعراف کی آیت ۳۴ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

"ہر قوم کے لئے مہلت کی ایک مدت مقرر ہے۔ پھر جب کسی قوم کی مدت پوری ہوتی ہے تو ایک گھڑی بھر کی تاخیر و تقدیم بھی نہیں ہوتی....."

اس کی توضیح میں مولانا صاحب فرماتے ہیں:

"مہلت کی مدت مقرر کئے جانے کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ ہر قوم کے لئے برسوں اور مہینوں اور دنوں کے لحاظ سے ایک عمر مقرر کی جاتی ہے اور اس عمر کے تمام ہوتے ہی اس قوم کو لازماً ختم کر دیا جاتا ہے۔ بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ ہر قوم کو دنیا میں کام کرنے کا جو موقع دیا جاتا ہے اس کی اخلاقی حد مقرر کر دی جاتی ہے بایں معنی کہ اس کے اعمال میں خیر اور شر کا کم سے کم کتنا تناسب برداشت کیا جا سکتا ہے۔ جب تک ایک قوم کی بڑی صفات اس کی اچھی صفات کے مقابلہ میں تناسب کی اس آخری حد سے فروتر رہتی ہیں۔ اس وقت تک اسے اس کی تمام برائیوں کے باوجود مہلت دی جاتی ہے اور جب وہ اس حد سے گزر جاتی ہیں تو پھر اس بدکار اور بدصفات قوم کو مزید کوئی مہلت نہیں دی جاتی....."

پس قوم کے ہر ذی شعور پر لازم ہے کہ وہ اس گراف پر نظر رکھے۔ یہ ہمارے ہر ایک کے بھلے میں ہے ورنہ بزرگ

سیاستدان، گوشہ نشین عامل، لاتعلق دانشور۔ غرضیکہ کوئی بھی اس مہلت کی گھڑی کے آنے پر بچ نہ پائے گا۔

اب اصل موضوع کی طرف پلٹتے ہوئے میری ناقص رائے میں قومی تقاضوں کی فہرست تو شاید طویل ہے۔ تاہم چند اہم عوامل ایسے ہیں، جن کو مزید ٹالا نہیں جا سکتا اور یہ معاشرہ اس بات کا جتنی جلدی ادراک کرے بہتر ہے۔

اوّلاً سیاست اور اخلاقیات

میرے نزدیک ہماری سیاست میں بنیادی اخلاقی اقدار کا فقدان ہماری اکثر مشکلات کا سبب ہے۔ دیکھنا ہوگا کہ ان اخلاقی اقدار کو کس طرح استوار کیا جائے کہ ہماری قومی سیاست میں ہمہ جہت اصلاح رُونما ہو۔

اس ضمن میں سب سے پہلے یہ جاننا ہوگا کہ سیاست میں اخلاقیات سے کیا مراد ہے۔ ہمارے پیارے نبیؐ نے نہائت سادہ پیرائے میں یوں فرمایا :۔

"تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں بن سکتا جب تک کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کے لئے وہی پسند نہ کرے جو وہ خود اپنے لئے پسند کرتا ہے۔"

ایک امریکی مفکّر ابراہم کپلان کی رُو سے اخلاقیات انسان کی اپنی یا دوسروں کی شخصیت کی اقدار کے تعیّن کا نام ہے اور اس عمل کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ انسان کے ہر فعل (جو اس کی اخلاقی اقدار کو متاثر کرے) کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ سیاسی زندگی میں اخلاقیات، صرف رشوت گیری، بگاڑ، دھوکا بازی یا ضمیر فروشی کی موجودگی یا عدم موجودگی کا نام نہیں ہے (اگرچہ ان عوامل کی موجودگی اخلاقی پستی کی قوی دلیل ہے) بلکہ اخلاقیات قومی پالیسی جو انسانی اقدار کو متاثر کرے کا جزوِ لاینفک ہے۔

ایک اور مفکّر کی رُو سے سیاست میں اخلاقیات، ان عوامل کا نام ہے جو تمام معاشرہ کے مفاد میں ہوں نہ کہ اپنی ذات، اپنے خاندان یا اپنے سیاسی گروہ کے لئے ہوں۔ اس کے برعکس اخلاقی پستی سے مراد ایسی پالیسی کی تشکیل ہے جو صرف ایک خاص گروپ کیلئے وضع کی جائے۔

اخلاقیات کے مندرجۃ الذکر بنیادی اصولوں کی روشنی میں سیاست کے ناخداؤں کے ہر فعل کے لئے معیار جس سے متعیّن کیا جا سکے کہ ان کا کون کون سا فعل مسلّمہ اخلاقی ضابطوں کے مطابق ہے یا برعکس ممکن نہیں۔

مَیں اس ضمن میں ملکی آئین کی روشنی میں صرف چند گذارشات پر اکتفا کرتا ہوں۔

سب سے پہلے آئین کے (آرٹیکل ۵) کو لیجئے! اس کی رُو سے :۔

۵ (۱) مملکت سے وفاداری ہر شہری کا بنیادی فرض ہے۔

(۲) دستور اور قانون کی اطاعت ہر شہری خواہ وہ کہیں بھی ہو اور ہر اس شخص کی جو فی الوقت پاکستان میں ہو (واجب التعمیل) ذمہ داری ہے"

تو گویا مملکت سے وفاداری اور آئین کی اطاعت قانونی موشگافیوں سے ماوراء اخلاقیات کی اساس ہے۔ اس کی مزید وضاحت میں ایک غلطی کی نشاندہی ضروری ہے۔ عام طور پر "قومی مفاد" کو "حکومتی مفاد" کے مماثل سمجھا جانے لگا ہے اور مملکت سے وفاداری کو حکومت کی وفاداری کے مترادف جانا جاتا ہے اور اس غلط نظریہ سے اکثر اخلاقی ضابطے مجروح ہوئے ہیں۔ ہو سکتا ہے۔ کسی ایک معاملہ میں قومی مفاد اور حکومتی مفاد ایک ہی ہو تاہم یہ ہر معاملہ میں ضروری نہیں اس لئے (آرٹیکل ۵) کے حوالہ سے حکومتی مفاد کو قومی مفاد پر ترجیح نہیں دی جا سکتی۔

اگر آرٹیکل ۵ کو اخلاقی اساس کے طور پر نقطۂ آغاز تسلیم کر لیا جائے تو قومی سیاسی زندگی میں قلبیتہً اخلاقی ضابطوں کو سمجھنا مشکل امر نہ ہوگا۔ چند مثالوں سے اس کی مزید وضاحت کی جا سکتی ہے۔ قراردادِ مقاصد سے لیکر ماضی کے تمام دساتیر اور موجودہ آئین کے ابتدایہ اور آرٹیکل ۲، ۲ الف اور ۲۲۷ کی رُو سے اس قوم نے تسلیم کر لیا ہے کہ اللہ تبارک تعالیٰ مملکت کا حاکمِ مطلق ہے اور پاکستان کے جمہور اختیار و اقتدار اس کی مقرر کردہ حدود کے اندر استعمال کرنے کے پابند ہیں، اور یہ کہ آئین کی رُو سے مسلمانوں کو اس قابل بنایا جائے گا کہ وہ انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنی زندگیاں اسلامی تعلیمات و مقتضیات کے مطابق جس طرح قرآنِ پاک و سنّت میں ان کا تعین کیا گیا ہے۔ ترتیب دے سکیں وغیرہ۔

اگر آئین کے اس مدعا کو ہم ایمان کی پختگی کے ساتھ تسلیم کر لیں تو ہمیں اخلاقِ معاشرت اور تمدن کے ایسے اصول اور قوانین جو خدا کے سوا کسی اور کی راہنمائی سے ماخوذ ہوں، کو ترک کرنا مشکل نہ ہوگا اور دینِ متین کے متعین کردہ اصولوں پر عمل کرنے سے ہمیں ارفع و اعلیٰ اخلاقی مقاصد حاصل کرنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئے گی۔ یہ جان لینا چاہیئے کہ اخلاقی پستی ہماری تمام مشکلات کی بنیاد ہے

اس ضمن میں ایک اور نکتہ جو انسانی حقوق سے متعلق ہے، کو سمجھنا بھی ضروری ہے۔ میری ناقص رائے میں انسانی حقوق سے پہلوتہی ہمارے اخلاقی بگاڑ کا سبب اور ربِّ کائنات سے بغاوت کے مترادف ہے۔ آئین کی رُو سے آرٹیکل ۴ ہر فرد کا ناقابلِ انتقال حق ہے، کہ اسے قانون کا تحفظ حاصل ہو اور اس کے ساتھ قانون کے مطابق سلوک کیا جائے اور کوئی ایسی کارروائی نہ کی جائے جو کسی شخص کی جان، آزادی، شہرت یا املاک کیلئے مُضر ہو سوائے جبکہ قانون اس کی اجازت دے۔ شرفِ انسانی (آرٹیکل ۱۴) اور قانون کے تابع گھر کی خلوت قابلِ حرمت ہے۔

ہر شہری کو (آرٹیکل ۱۷) قانون کے تابع انجمنیں یا یونین بنانے کا حق ہے۔ اسلام (آرٹیکل ۱۹) کی عظمت یا پاکستان یا اس کے کسی حصّہ کی سالمیت، سلامتی۔ دفاع، غیر ممالک کے ساتھ دوستانہ تعلقات۔ امنِ عالم، تہذیب یا اخلاق کے مفاد کے پیشِ نظر توہینِ عدالت کے ضمن میں قانون کے ذریعے عائد کردہ پابندیوں کے تابع ہر شہری کو تقریر اور اظہارِ خیال کی آزادی کا حق ہے، اور پریس آزاد ہیں۔ کسی شخص کو (آرٹیکل ۲۴) اس کی جائیداد سے محروم نہیں کیا جاسکتا۔ سوائے اس کے جب قانون اس کی اجازت دے وغیرہ وغیرہ۔

اس موضوع پر مزید کچھ کہنے سے پہلے ایک بات ذہن نشین کراتا جاؤں کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ انسانی حقوق کی حفاظت صرف عدلیہ کا کام ہے۔ حالانکہ اس میں ہر شہری ہر سیاسی گروہ۔ ہر با اختیار فرد، انتظامیہ من جملہ پر لازم ہے کہ کسی ایسے فعل کے مرتکب نہ ہوں جس سے کسی شخص یا جماعت کے حقوق متاثر ہوں۔ تو اگر ہم من حیث القوم مندرجۃ الذکر حقوق کی افادیت کو تسلیم کرلیں اور یہ جان لیں کہ ان کا تحفظ ہمارا اخلاقی اور آئینی فریضہ ہے تو یہ کہنے میں ذرا بھی باک نہیں کہ ہماری سیاسی زندگی جلاء پکڑ لے گی۔ یہی وقت کا اہم ترین تقاضا ہے۔ ایسی صورت میں الزامات کہ مخالفین کو فرضی پولیس مقابلوں میں مارا جارہا ہے کہ لوگوں کو سیاسی دباؤ کی خاطر جھوٹے مقدمات میں ملوث کیا جارہا ہے کہ مخالف حکومت کو بدنام اور ناکام کرنے کی خاطر امنِ عامہ میں خلل ڈالا جارہا ہے۔ دہشت گردی میں بھی سیاسی گروہ ملوث ہیں کہ عوامی نمائندوں کی خرید و فروخت ہوتی ہے وغیرہ ازخود ختم ہوجائیں گے اور اگر یہ الزامات کسی حد تک درست ہیں تو مندرجۃ الذکر اخلاقی اقدار کی روشنی میں ان کا تکرار باقی نہ رہے گا۔

جیسا کہ میں نے موضوع کے شروع میں کہا تھا کہ انسان کے ہر فعل کے لئے اخلاقی معیار مقرر کرنا ممکن نہیں تاہم موضوع کو ختم کرتے ہوئے ایک بات ضرور کہنا چاہوں گا، وہ یہ کہ ہر فرد اپنے ہر عمل سے پہلے اپنے آپ سے پوچھے کہ ایسا کرنا قومی مفاد سے متصادم تو نہیں اگر جواب مثبت میں ہو تو اسے ترک کردے۔ ایسا کرنے سے کم از کم قومی سیاسی زندگی میں سدھار لازماً وجود میں آئے گا۔

بیوروکریسی اور اخلاقیات

جیسا کہ میں نے ابتداء میں کہا کہ ہماری بیوروکریسی پر الزام ہے کہ وہ اپنے آپ کو ہر حکمران سیاسی جماعت کا حصّہ تصوّر کرتے ہوئے نہ صرف یہ کہ اس سیاسی جماعت کے منشور کی ترویج کا ذمہ اپنے اوپر لیتی ہے بلکہ مخالف سیاسی جماعتوں کو غیر آئینی طور سے دبانے سے بھی گریز نہیں کرتی۔ حکمران جماعت کے سیاسی کل پرزوں کو اپنا آقا تصوّر کرتی ہے اور پھر سب خرابیاں وجود میں آتی ہیں جن کا ذکر مضمون کے پہلے حصّہ میں کرچکا ہوں۔

اس لئے لازم ہے کہ بیوروکریسی کا ہر فرد "اخلاقی آزادی" (ایک امریکن مفکر کی رُو سے ETHICAL AUTONOMY) کا مظہر ہو۔ قانون کے مفکرین کی رُو سے اخلاقی آزادی سے مراد ہے کہ کسی امر کا فیصلہ کرتے ہوئے فیصلہ کنندہ اپنی اصولی رائے کو حاوی کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس نہ کرے خواہ خود ساختہ اصولوں سے ہی متصادم کیوں نہ ہو۔ کہا جاتا ہے کہ امریکیوں کو جنگ ویت نام اور واٹر گیٹ سکینڈل سے دوچار نہ ہونا پڑتا اگر امریکن بیوروکریسی کے سینئر حکام اپنی ضمیر کے مطابق نہ کہ ایک اچھے ٹیم ممبر کے طور رائے دیتے۔ ظاہراً یہ بات بہت مشکل نظر آتی تھی، تاہم تاریخ میں ایسی مثالیں موجود ہیں کہ باضمیر لوگوں نے اپنی ملازمتوں کو قومی مفاد پر قربان کر دیا۔ جب امریکن صدر ٹرومین نے مسٹر ریڈون ڈبلیو پالے کو بحریہ میں انڈر سیکرٹری تعین کیا تو چونکہ یہ سیکرٹری داخلہ مسٹر ہالڈ کی نظر میں قومی مفاد میں نہ تھا۔ اس نے اپنے عہدہ سے استعفیٰ دے دیا۔ اسی طرح امریکن اٹارنی جنرل مسٹر رچرڈسن اور ڈپٹی اٹارنی جنرل ولیم نے صدر نکسن کے حکم کہ سپیشل پراسیکیوٹر کو برطرف کر دیا جائے، ماننے سے انکار کرتے ہوئے اپنی ملازمتوں سے استعفیٰ دے دیئے۔

اس لئے بیوروکریسی کے ضمن میں جن ضابطہ ہائے اخلاق کی پابندی کی توقع کی جاسکتی ہے۔ ان میں کم از کم یہ ہے کہ بیوروکریسی کا ہر با اختیار فرد اپنی اصولی رائے میں جو کہ اس کی اپنی دانست میں قومی مفاد میں ہو، کو پیش کرنے کی جرأت رکھتا ہو۔ یہی حکم خداوندی ہے:

"تم معروف کا حکم کرو اور منکرات سے منع کرو" (سورۃ الحج آیت ۴۱)

آئینی عملداری

جیسا کہ اس آرٹیکل کے ابتداء میں تذکرہ ہے کہ وفاقی اور دو صوبائی حکومتوں کے مابین محاذ آرائی کی سی کیفیت ہے اور قوم حالتِ گومگو سے دوچار ہے۔ اس لئے وہ سب دھرائے بغیر دیکھنا ہوگا کہ ان مشکلات سے کیسے عہدہ براء ہوا جائے وگرنہ خاکم بدہن قومی سالمیت تک کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے اور اس ضمن میں ہم خارجی اور داخلی خطرات کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔

میرے نزدیک موجودہ حالات مقتضی ہیں کہ ہم آئین پر بلا کم و کاست اور صدق دل سے عمل پیرا ہوں ہمارا آئین ہر حالت میں ہر مشکل کے حل کا مداوا ہے اور اگر ایسا نہیں تو میں کہوں گا کہ ہمارے بزرگ اس بھروسے پر پورا اترنے میں ناکام رہے، جو قوم نے ان پر کیا۔ آئینی عملداری کی صورت میں نہ کسی مصالحتی کمیٹی کی ضرورت ہے گی اور نہ ہی دیگر ایکسٹرا کانسٹی ٹیوشنل اقدامات کی۔ میری ناقص رائے میں محاذ آرائی

کا سلسلہ بھی بند ہو جائے گا۔ آئینی عملداری آئین پر منجملہ بلاکم و کاست عمل پیرا ہونا مراد ہے۔ تاہم اس آرٹیکل میں مَیں صرف آئین کے ان حصوں کی نشاندہی کروں گا۔ جن کا تعلق مرکز اور صوبائی حکومتوں کے روابط اور باہمی تعلقات سے ہے۔ اس کے علاوہ دیگر نزاعی مسائل کا سرِراہ تذکرہ۔ ہم جتنی جلدی اس امر کا ادراک کرلیں کہ کم از کم آئین کے ان حصوں پر عملدرآمد کو مزید ٹالنا ہمارے قومی مفاد میں نہیں۔ ہمارے لئے بہتر ہے۔

قانون سازی

قانون سازی کے ضمن میں صوبائی اور مرکزی حکومت کا دائرہ اختیار ایک نہایت سیدھے سادے طریقۂ کار پر مبنی ہے اور اس کی بنیادی رُوح صوبائی خودمختاری ہے۔ آئین کے تابع (آرٹیکل ۱۴۱) مجلسِ شوریٰ پورے پاکستان یا اس کے کسی حصّہ کیلئے قوانین بنا سکتی ہے اور اسی طرح کوئی صوبائی اسمبلی اس صوبے یا اس کے کسی حصّہ کیلئے قانون نافذ کرنے کی مجاز ہے۔ آئین میں دو فہرستیں وفاقی قانون سازی کی فہرست اور مشترکہ قانون سازی کی فہرست مرتب کی گئی ہیں۔ مجلسِ شوریٰ (آرٹیکل ۱۴۲) کو وفاقی قانون سازی کی فہرست میں شامل کسی امر کے بارے بلا شرکتِ غیرے قانون بنانے کا اختیار ہے۔ مزید یہ کہ مجلسِ شوریٰ اور کسی بھی صوبائی اسمبلی کو مشترکہ قانون سازی کی فہرست میں شامل امور کے بارے میں قانون سازی کا اختیار ہے۔ کسی امر کے بارے میں جو وفاقی فہرست یا مشترکہ قانون سازی کی فہرست میں شامل نہیں۔ قانون سازی کا اختیار صرف صوبائی اسمبلی کو ہے اور مجلسِ شوریٰ ایسے معاملہ کے لئے قانون سازی نہیں کرسکتی۔ تاہم ایسے امور میں بھی مجلسِ شوریٰ کو قانون سازی کا اختیار صرف ان علاقوں کے لئے ہے جو کسی صوبہ میں نہیں۔ اگر (آرٹیکل ۱۴۳) صوبائی اسمبلی کا جاری کردہ کوئی ایکٹ یا اس کا کوئی حصّہ کسی ایکٹ یا حکم سے متصادم ہو۔ جسے وضع کرنے کی مجلسِ شوریٰ مجاز ہو یا مشترکہ قانون سازی کی فہرست میں مندرج امور میں سے کسی کے متعلق ہو تو مجلسِ شوریٰ کا نافذ کردہ قانون فائق ہوگا۔ اس سب کے باوجود (آرٹیکل ۱۴۴) دو یا دو سے زیادہ صوبائی اسمبلیاں اس مضمون کی قرارداد منظور کریں کہ مجلسِ شوریٰ کسی ایسے معاملہ میں جو ہر دو فہرستوں میں درج نہ ہو کے متعلق قانون سازی کرے۔ تو مجلسِ شوریٰ کی اس معاملہ میں قانون سازی درست تصور ہوگی۔ تاہم ایسے قانون کو تنسیخ یا ترمیم کرنے کا صوبائی اسمبلی کو اختیار ہوگا۔

اسی طرح (آرٹیکل ۲۳۲) ہنگامی حالت کے نفاذ پر بھی مجلسِ شوریٰ کسی ایسے معاملے میں قانون سازی کرسکے گی۔ جو ہر دو فہرستوں میں درج نہ ہو مگر اس طرح کا جاری کردہ قانون ہنگامی حالت کے خاتمے کے

۶ ماہ بعد از خود غیر مؤثر ہو جائے گا اور مجلس شوریٰ کے اس اختیار کے باوجود صوبائی اسمبلی کے کوئی ایسا قانون وضع کرنے پر پابندی عائد نہیں ہوگی جس کے وضع کرنے کا اسے دستور کے مطابق اختیار حاصل ہے۔ تاہم مجلس شوریٰ اور صوبائی اسمبلی کے وضع کردہ قانون کے تصادم کی صورت میں مجلس شوریٰ کے نامزد کردہ قانون کو فوقیت حاصل ہوگی۔

تو قانون سازی کے ضمن میں آئین کی رُو سے مفصل طریقۂ کار موجود ہے۔ جس کی میں مزید وضاحت کی ضرورت محسوس نہیں کرتا اور قارئین پر چھوڑتا ہوں کہ وہ فیصلہ دیں کہ اگر آئین کے اس حصہ پر صدقِ دل سے عمل کیا جائے تو مجلس شوریٰ اور صوبائی اسمبلی کے مابین قانون سازی کے میدان میں کسی اختلاف کی گنجائش نہیں رہتی۔

وفاق اور صوبوں کے درمیان انتظامی تعلّقات

یہ بات اپنی جگہ بجا ہے کہ آجکل وفاقی اور دو صوبائی حکومتوں کے اختلافات کے ضمن میں انتظامی تعلّقات میں بگاڑ ہی سب سے بڑی وجہ ہے۔ انتظامی اختیارات کے استعمال میں آئینی حدود کو پامال کیا جا رہا ہے۔ اور نتیجۃً بیوروکریسی دباؤ کا شکار ہے۔ میری ناقص رائے میں اس ضمن میں بھی اگر آئینی حدود میں رہا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ صوبوں اور مرکز کے مابین انتظامی روابط ایک احسن شکل اختیار نہ کر لیں۔

مختصراً دستور میں شامل کسی امر کے باوجود (آرٹیکل ۱۴۶) وفاقی حکومت صوبائی حکومت کی رضامندی سے اپنے عاملانہ اختیار جو اس کے دائرہ کار میں ہوں صوبائی حکومت یا اس کے عہدیداروں کے سپرد کر سکتی ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ صوبائی حکومت یا ان کے عہدیدار اس اختیار کی بجا آوری کے پابند ہیں۔ اسی طرح باوجود اس امر کے کہ صوبائی حکومت کو کسی معاملہ میں قانون سازی کا اختیار نہ بھی ہو تو مجلس شوریٰ کے نافذ کردہ قانون کے ذریعے اس معاملہ میں اختیارات صوبائی حکومت یا اس کے عہدیداروں کے سپرد کئے جا سکتے ہیں اور ان اختیارات کی بجا آوری میں اٹھنے والے اخراجات وفاقی حکومت و صوبائی حکومت کی باہمی رضامندی سے متعین ہونگے، یا اختلافات کی صورت میں جو چیف جسٹس پاکستان کا نافذ کردہ ثالث متعین کرے۔ صوبائی حکومت کو ادا کئے جائیں گے۔ عین اسی طرح (آرٹیکل ۱۴۷) صوبائی حکومتوں کے عاملانہ اختیار وفاق کے سپرد کئے جا سکتے ہیں۔

ہر صوبائی حکومت پر لازم ہے کہ (آرٹیکل ۱۴۸) اپنے عاملانہ اختیارات کا استعمال اس طور کرے کہ اس سے ان وفاقی قوانین کی پابندی کی ضمانت ملے جو اس صوبے میں اطلاق پذیر ہوں تاہم ان کے استعمال میں صوبے کے مفاد کا لحاظ رکھا جائے۔ وفاق کا یہ فرض کہ ہر صوبے کو بیرونی جارحیت اور اندرونی خلفشار سے محفوظ رکھے۔

اور اس بات کو یقینی بنائے کہ ہر صوبے کی حکومت دستور کے احکام کے مطابق چلائی جائے وغیرہ وغیرہ۔

خاص احکام

مشترکہ مفادات کی کونسل (آرٹیکل ۱۵۳)

مشترکہ مفادات کی کونسل کا قیام آئینی ذمہ داری ہے۔ اس کونسل کا تقرر صدر پاکستان کرتا ہے۔ صوبوں کے وزرائے اعلیٰ بلحاظ منصب اس کے رکن ہوتے ہیں اور مساوی تعداد میں وفاقی حکومت کے ارکان جن کو وزیراعظم نامزد کرتے ہیں۔ رکن ہوتے ہیں۔ اگر وزیراعظم اس کا رکن ہو تو وہ کونسل کا چیئرمین ہوگا۔ بصورتِ دیگر صدر کسی وفاقی وزیر کو جو کونسل کا رکن ہو چیئرمین مقرر کر سکتا ہے۔ کونسل مجلس شوریٰ کے سامنے جواب دہ ہوتی ہے۔ کونسل کے فیصلے اکثریت رائے سے ہوتے ہیں اور یہ صرف ایسے معاملات کے متعلق جو قانون سازی کی فہرست کے حصہ دوم میں مندرج ہیں اور مشترکہ قانون سازی کی فہرست کے اندراج ۳۴ (بجلی) کے متعلق حکمتِ عملی تشکیل دے سکتی ہے۔ اور اسے متعلقہ اداروں کی نگرانی اور کنٹرول کا اختیار ہے۔ مزید یہ کہ مجلس شوریٰ اپنے مشترکہ اجلاس میں قرارداد کے ذریعے کسی خاص معاملہ میں جو مبنی بر اتفاق اور مناسب خیال کرے۔ ہدایات جاری کر سکتی ہے اور کونسل ان ہدایات کی تعمیل کی پابند ہے۔

اگر وفاقی حکومت یا کوئی صوبائی حکومت کونسل کے فیصلہ سے مطمئن نہ ہو تو معاملہ مجلس شوریٰ کی مشترکہ نشست میں اٹھایا جا سکتا ہے۔ علاوہ ازیں صوبائی یا وفاقی حکومت قدرتی سرچشمہ آب رسانی کے استعمال میں بیان کردہ مخصوص وجوہات کی بناء پر کونسل کو شکایت کر سکتی ہے۔ اختتاماً وفاقی حکومت یا متنازعہ معاملہ کے متعلق صوبائی حکومت کا فرض ہوگا کہ وہ کونسل کے فیصلے کو وفاداری کے ساتھ لفظاً لفظاً نافذ کرے۔

آئین کے اس حصہ کی تکمیل میں مسلسل اغماض برتا جا رہا ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ ایسا کیوں ہے۔ کیا یہ قومی مفاد میں نہیں کہ ان معاملات کے متعلق حکمتِ عملی وضع کی جائے۔ جو وفاقی قانون سازی کی فہرست کے حصہ دوم میں ہے۔

یہ معاملات صرف معدنی تیل، قدرتی گیس، صنعتی ترقی، وفاق کے زیر انتظام صنعتی ادارے اور بجلی کے متعلق ہیں کہ یوں تصور کر لیا جائے کہ ایسا کرنے سے شاید حکومتی مفاد کو ذک پہنچنے کا خطرہ ہے۔ مزید برآں آرٹیکل ۵ سے ماوراء کیا وزیراعظم اور صدرِ پاکستان نے یہ حلف نہیں اٹھایا کہ وہ اپنے فرائض.... اسلامی جمہوریہ پاکستان کے دستور کے مطابق سرانجام دیں گے۔ لہٰذا کونسل کی تشکیل سے مزید اغماض سراسر قومی مفاد میں نہیں ہے۔ اور مزید تاخیر آئینی انحراف کے مترادف ہے۔

قومی اقتصادی کونسل

آرٹیکل کی طوالت اور اس امر کے پیشِ نظر کہ اب اقتصادی کونسل کا قیام وجود میں آگیا ہے۔ میں سوائے اس کے کہ میری دعا ہے کہ یہ کونسل قومی مفاد اور صرف قومی مفاد کو مدِنظر رکھ کر اپنے فرائض سرانجام دے، کچھ نہیں کہتا!

عوامی نمائندگی

جیسا کہ میں نے اس مضمون کی ابتدا میں رقم کیا ہے۔ جمہوری نظام کا یہ خاصا ہے کہ اکثریتی جماعت کو حقِ حکمرانی حاصل ہوتا ہے یا بالفاظِ دیگر، اکثریتی جماعت کو حقِ حکمرانی کا عوامی مینڈیٹ حاصل ہو جاتا ہے اور یہی حکومت کے جائز ہونے کی قطعی دلیل ہے۔

ہمارے ہاں الیکشن عام طور پر سیاسی وابستگیوں کی بناء پر ہوتے ہیں۔ پارٹی کے نام پر انتخابی نشان الاٹ ہوتے ہیں اور اس جماعت کے ہر امیدوار کو وہی نشان دیا جاتا ہے۔ ہمارے عوام سیاسی طور پر باشعور ہیں۔ اس لئے ووٹ دیتے وقت ہر رائے دہندہ امیدوار کی ذاتی حیثیت کے قطع نظر اس امیدوار کی سیاسی وابستگی کی بناء پر ووٹ دیتا ہے۔ اس لئے رائے دہندگان امیدوار کی کامیابی کی صورت میں اس سے کم از کم دو باتوں کی توقع رکھتے ہیں۔ پہلی یہ کہ وہ اپنی جماعت کا وفادار رہے گا اور ثانیاً یہ کہ وہ اپنے رائے دہندگان کے بھروسے کو کسی طور مجروح نہیں کرے گا۔

میرے نزدیک ہر دو عوامل ایک ناقابلِ تنسیخ معاہدہ اور امانت کے مترادف ہیں۔ آج کل عوامی نمائندے بھیڑ بکریوں کی طرح بکنا شروع ہو گئے۔ جماعتی وفاداریاں نیلام ہو رہی ہیں۔ یہ اگر امانت میں خیانت نہیں تو اور کیا ہے۔ عوامی نمائندوں کا یہ کردار اخلاقی پستی کی بدنما گھاٹی میں سے گذرتا ہوا گناہ کی حدود میں داخل ہونے کے مترادف ہے۔ سورۃ الانفال آیت ۲۷ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:۔

"..... اپنی امانتوں میں خیانت کے مرتکب نہ ہو ....."

پھر آیت ۵۸ میں بیان ہوتا ہے۔

"..... یقیناً اللہ خائنوں کو پسند نہیں کرتا ....."

اور یہ تو مسلمہ امر ہے۔ اسلام کی رُو سے عہد شکنی بدترین گناہ ہے اور کچھ مفکرین کی رُو سے یہ گناہِ کبیرہ ہے۔

مزید یہ کہ کچھ عوامی نمائندے عدلیہ کی کھلے بندوں تضحیک کے مرتکب ہوئے ہیں۔ اس لئے میری ناقص رائے میں ہر دو صورتوں میں عوامی نمائندے اپنے حقِ نمائندگی کھو چکے ہیں اور آئین کی رُو سے انہیں نیشنل اسمبلی میں بیٹھنے کا حق نہیں۔ اس ضمن میں میں آئین کے آرٹیکل ۶۲ـ۶۳ کے کچھ حصوں کو من وعن پیش کرتا ہوں۔

" ۶۲۔ کوئی شخص مجلسِ شوریٰ کا رُکن منتخب ہونے یا چُنے جانے کا اہل نہیں ہوگا۔

اگر ______

(د) وہ اچھے کردار کا حامل نہ ہو اور عام طور پر احکامِ اسلام سے انحراف میں مشہور ہو:۔

(ہ) وہ اسلامی تعلیمات کا خاطر خواہ علم نہ رکھتا ہو اور اسلام کے مقرر کردہ فرائض کا پابند نیز کبیرہ گناہوں سے مجتنب نہ ہو۔

(و) وہ سمجھ دار پارسا نہ ہو۔ اور فاسق ہو اور ایماندار اور امین نہ ہو :۔

(ز) کسی اخلاقی پستی میں ملوّث ہونے یا جھوٹی گواہی دینے کے جُرم میں سزا یافتہ ہو۔

(ح) اس نے قیامِ پاکستان کے بعد مُلک کی سالمیت کے خلاف کام کیا ہو یا نظریۂ پاکستان کی مخالفت کی ہو۔

" ۶۳:۔ کوئی شخص مجلسِ شوریٰ کے رکن کے طور پر منتخب ہونے یا چُنے جانے اور رکن رہنے کیلئے نا اہل ہوگا۔ اگر ______

(ز) وہ کسی ایسی رائے کی تشہیر کر رہا ہو یا کسی ایسے طریقے پر عمل کر رہا ہو جو نظریۂ پاکستان یا پاکستان کے اقتدارِ اعلیٰ، سالمیت یا سلامتی یا اخلاقیات، یا امنِ عامہ کے قیام یا پاکستان کی عدلیہ کی دیانتداری یا آزادی کے لئے مضر ہو۔ یا جو پاکستان کی مسلح افواج یا عدلیہ کو بدنام کرے یا اس کی تضحیک کا باعث ہو۔

موضوع کے اختتام سے پہلے میں مندرجۃ الذکر آئینی حوالہ جات کی روشنی میں ایک اہم قومی مسئلہ کی طرف توجہ دلاتا ہوں۔ میری ناقص رائے میں اگر آئین کے یہ حصے صرف کاغذی زینت کے طور پر استعمال کرنے کے ارادہ سے نافذ نہ ہوئے ہوں تو ان پر صدقِ دِل سے عملدرآمد کرنے سے ایک معاشرہ کی ترویج کی بنیاد پڑ سکتی ہے اور ہماری قوم ایک ارفع اور بااصول قوموں کی صف میں شمار ہو سکتی ہے۔

قرآنِ مبین کی رُو سے قبائل اور شعوب صرف پہچان کا ذریعہ ہیں اور دنیاوی تکریم کے حقدار صرف صاحبِ تقویٰ لوگ ہیں اور یہی نظریہ آئین کے اس حصّہ کی روح نظر آتا ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں قبائل اور شعوب نہ کہ تقویٰ دنیاوی تکریم کی علامت ہیں اور انتخابات میں بھی قبائلی اور نسلی وابستگیاں فیصلہ کُن حد تک اثر انداز ہوتی ہیں دیکھنا ہوگا کہ آئین کے یہ حوالہ جات از خود کارفرما ہیں یا ان کے نفاذ کے لئے کوئی طریقہ وضع کرنا ہوگا۔

ہر دو صورتوں میں قوم پر لازم آتا ہے کہ آئین کے اس حصّہ کی ترویج کو یقینی بنایا جائے۔

ایران کی کونسل آف ایلڈرز کی طرز کا ادارہ تشکیل دیا جاسکتا ہے جو الیکشن سے پہلے ہر امیدوار کا آئین کے مندرجۃ الذکر حصوں کی روشنی میں کردار کا جائزہ لے اور صرف اس شخص کو انتخابات میں حصہ لینے کی اجازت ہو جو تقویٰ کے معیار پر پورا اُترے۔

افواجِ پاکستان

آج کل یہ بحث بھی ایک نزاعی مسئلہ کی صورت اختیار کرتی جارہی ہے کہ قیامِ امن کیلئے (صوبہ سندھ کے حوالہ سے) افواجِ پاکستان کو عدالتی اختیارات سونپے جائیں اور اس ضمن میں غالباً آرڈیننس کا اجراء زیرِ غور ہے۔ میری ناقص رائے میں افواجِ پاکستان کو سول عدالتوں کی موجودگی میں عدالتی اختیارات تفویض کرنے جن سے وہ عام شہری کے مقدمہ کی سماعت کرسکے، آئینی روح کے منافی اور کسی صورت قومی مفاد میں نہیں۔ اس رائے کی وضاحت میں سب سے پہلے آئین کے متعلقہ حصوں کو دیکھنا ہوگا جن کو میں من وعن پیش کرتا ہوں۔

آرٹیکل " ۱۴۸ (۳) وفاق کا یہ فرض ہوگا کہ ہر صوبے کو بیرونی جارحیت اور اندرونی خلفشار سے محفوظ رکھے اور اس بات کو یقینی بنائے کہ ہر صوبے کی حکومت دستور کے احکام کے مطابق چلائی جائے۔"

آرٹیکل " ۲۴۵ (۱) مسلح افواج۔ وفاقی حکومت کی ہدایات کے تحت بیرونی جارحیت یا جنگ کے خطرہ کے خلاف پاکستان کا دفاع کریں گے اور قانون کے تابع شہری حکام کی امداد میں جب ایسا کرنے کے لئے طلب کی جائیں کام کریں گی۔

(۲) شق (۱) کے تحت وفاقی حکومت کی طرف سے جاری شدہ کسی ہدائت کے جواز کو کسی عدالت میں زیرِ اعتراض نہیں لایا جائے گا

(۳) کوئی عدالتِ عالیہ کسی ایسے علاقے میں جس میں پاکستان کی مسلح افواج فی الوقت آرٹیکل ۲۴۵ کی تعمیل میں شہری حکام کی مدد کیلئے کام کر رہی ہوں۔ آرٹیکل ۱۹۹ کے تحت کوئی اختیارِ سماعت استعمال نہیں کرے گی۔

مگر شرط یہ ہے کہ اس شق کا اس دن سے عین قبل جس پر مسلح افواج نے شہری حکام کی مدد کیلئے کام شروع کیا ہو کسی زیرِ سماعت کاروائی کے متعلق عدالتِ عالیہ کے اختیارِ سماعت کو متاثر کرنا متصور نہیں ہوگا۔

(۷)۔ شق (۳) میں محولہ کسی علاقے سے متعلق کوئی کاروائی جسے اس دن یا اس کے بعد دائر کیا گیا ہو

جبکہ مسلح افواج نے شہری حکام کی مدد کے لئے کام شروع کیا ہو اور جو کسی عدالتِ عالیہ میں زیرِ سماعت ہو اس عرصہ کیلئے معطل رہے گی جس کے دوران مسلح افواج بہ ایں طور کام کر رہی ہوں۔

مزید کچھ کہنے سے پیشتر یہ بتاتا جاؤں کہ اس آرٹیکل کی ضمنی شق ہائے ۲ تا ۴ آئین کے ترمیمی ایکٹ ۲۳ الف ۱۹۷۷ء کی رُو سے نافذ ہوئیں۔

مزید براں کہ ۱۹۷۷ء کے ایکٹ ۱۱ کی رُو سے ڈیفنس آف پاکستان آرڈیننس میں دُور رس ترمیمات کی گئیں اور ۱۹۷۷ء کے ایکٹ ۱۰ کے ذریعے ۱۹۵۲ء کے آرمی ایکٹ میں ترمیم کرکے فوج کو اختیار دیا گیا کہ وہ عام شہری کے خلاف کئی ایک جرائم کے متعلق مقدمات کی سماعت کر سکیں۔ اس کے علاوہ فیڈرل گورنمنٹ نے ایک نوٹیفکیشن کے ذریعے ڈیفنس آف پاکستان رولز کے تحت بہت سے اختیارات افواج پاکستان کو سونپ دیئے۔ ان ترمیمات کی آئینی حیثیت کو لاہور ہائیکورٹ کے فل بنچ کے سامنے درویش ایم عاربی بنام فیڈریشن آف پاکستان میں اٹھایا گیا (پی۔ایل۔ڈی ۱۹۷۷ء لاہور ۸۴۶) عدالت نے ان تمام ترمیمات کو غیر آئینی قرار دیا۔ اس لئے مزید بحث میں جانے سے قبل یہ کہنا ہی کافی ہوگا کہ عدالتِ عالیہ کے فیصلہ کی روشنی میں اب پھر فوج کو عدالتی اختیارات سونپنا توہینِ عدالت کے مترادف اور آئین کی کھلی خلاف ورزی تصور ہوگا۔ تاہم اس ضمن میں اور بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ مندرجۃ الذکر آئین کے آرٹیکلز کی کسی طور تشریح و تعبیر نہیں کی جا سکتی کہ ان میں فوج کو عدالتی اختیار دیئے جانے کا حق مضمر ہے۔ مزید براں ایسا کرنا انصاف کے فطری اصول جسے اقوامِ عالم میں قانونی حیثیت حاصل ہے۔ کہ کوئی شخص اپنے ہی (کاز CAUSE) میں جج نہیں بن سکتا، کے خلاف ہے۔ اگر کسی ادارے کے حکم کی رُو سے کسی شخص کو موردِ الزام ٹھہرایا گیا ہو تو کیا وہی ادارہ ایسے شخص کے خلاف سماعت مقدمہ کرنے کا مجاز ہونا چاہیئے؟

اگر اسی اصول پر پولیس بھی عدالتی اختیارات کا مطالبہ کرے تو یہ مطالبہ کہاں تک درست ہوگا؟ اقوامِ عالم میں ایسی مثالیں موجود ہیں جن میں اس قسم کے مطالبات کو واشگاف الفاظ میں رد کیا گیا۔ دستوری قانون کے مشہور مصنف ڈائسی کی رُو سے:۔

> " اس قسم کا مارشل لاء انگلینڈ کے آئین کی رُو سے ناشنید ہے۔ فوج اندرونی بدامنی کو روکنے کی اتنی ہی ذمہ دار ہے جتنی بیرونی دشمن کے حملہ کو روکنے کی۔ وہ باغیوں کے ساتھ اسی طرح لڑ سکتی ہے جس طرح بیرونی دشمنوں سے۔ تاہم قانون کی رُو سے اسے باغیوں اور فسادیوں کو سزا دینے کا کوئی حق نہیں۔ بغاوت کے فرو کرتے وقت باغیوں کو بھی اسی طرح مار سکتی ہے جس طرح میدانِ جنگ میں دشمنوں کے قیدی کی بھاگنے کی کوشش کو روک سکتی ہے مگر کورٹ مارشل کی طرف سے دی گئی موت کی سزا

قطعاً غیر آئینی ہے اور قتل کے مترادف ہے۔"

المختصر ان گذارشات کی روشنی میں اس مسئلہ کو باعثِ نزاع نہیں بنانا چاہیئے اور قومی سطح پر ہر ایک کو تسلیم کر لینا چاہیئے کہ فوج کو عدالتی اختیارات نہ سونپے جائیں۔

شریعت کا نفاذ

نفاذِ شریعت بل سینیٹ نے منظور کر لیا ہے اور اب معاملہ نیشنل اسمبلی کے سامنے ہے اس کے محرکین اور علماء کا ایک خاص طبقہ اس کے من وعن پاس کرانے پر بضد ہے۔ مرکزی حکومت اس بل کے پاس ہونے کے حق میں نہیں ہے۔ کچھ دانشوروں کا خیال ہے کہ شریعت بل کے پاس ہونے سے فرقہ واریت کو فروغ ملے گا۔ اور اس بل کا پاس کرنا کسی صورت بھی ملکی مفاد میں نہ ہوگا۔ مجھے یہ کہنے میں ذرا برابر باک نہیں کہ ایک خاص مسلک کی فقہ کو رائج کرنے سے فرقہ واریت جنم لے گی اور یہ کسی صورت ملکی مفاد میں نہیں[1]، تاہم اس امر سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس ملک میں اسلامی نظام کا نفاذ اٹل حقیقت ہے۔

حسن وقبح پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ جسے میں دہرانا نہیں چاہتا۔ صرف ایک امر کی نشاندہی کر کے اس موضوع کو ختم کر دونگا۔ تاہم اپنے نقطۂ نظر کو بیان کرنے سے پیشتر ایک دو بنیادی باتوں کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں یہ دیکھنا ہوگا کہ کیا ایسے احکام جو فقہاء کی قیاس، رائے اور اجماع سنّت پر مبنی ہوں انکو شریعت تصور کیا جا سکتا ہے۔

اس ضمن میں سب سے پہلے میں مفہومِ شریعت کو لیتا ہوں۔ شرع کے لغوی معنی راستہ بنانے کے ہیں اور اصطلاحاً اس سے مراد طریقہ اور ضابطہ اور قاعدہ مقرر کرنا ہے۔ عربی زبان میں اصطلاحی لحاظ سے تشریع کا لفظ قانون سازی (TO LEGISLATE) کا۔ شرع اور شریعت کا لفظ قانون (LAW) کا اور شارع کا لفظ واضع قانون (LAW GIVER) کا ہم معنی سمجھا جاتا ہے۔ قرآن مبین سے ظاہر ہے کہ اسلام میں واضع قانون (LAW GIVER) صرف اور صرف اللہ تبارک وتعالےٰ کی ذات ہے دیکھیں سورۃ الشوریٰ کی آیت، جو ارشادِ باری تعالےٰ ہے:۔

"(شَرَعَ لَكُمْ) اس نے تمہارے لئے دین کا وہی طریقہ منتخب کیا ہے جس کا حکم اس نے نوحؑ

---

[1] جولائی اور اگست ۱۹۹۰ء کے شماروں میں طلوعِ اسلام اس موضوع پر بوضاحت لکھ چکا ہے۔ فرقہ واریت کے موضوع پر "اللہ کے نزدیک ناقابلِ معافی گناہ" کے عنوان سے شائع ہونے والا محمد عمر دراز صاحب کا مضمون اگست ۱۹۹۰ء کے شمارہ میں ملاحظہ فرمائیں۔

کو دیا تھا اور جسے (اے محمدؐ) اب تمہاری طرف ہم نے وحی کے ذریعہ بھیجا ہے اور جس کی ہدایت ہم ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو دے چکے ہیں اس تاکید کے ساتھ کہ قائم کرو، اس دین کو اور اس میں متفرق نہ ہو جاؤ یہی بات ...... "

اس آیت میں الفاظ " شَرَعَ لَکُمۡ " قابلِ غور ہیں۔ پھر سورۃ الجاثیہ کی آیت ۱۸ میں ارشادِ ربِّ کعبہ ہے۔

"...... اس کے بعد اب اے نبیؐ! ہم نے تم کو دین کے معاملہ میں ایک صاف شاہراہ (شریعت) پر قائم کیا ہے۔ لہٰذا تم اسی پر چلو اور ان لوگوں کی خواہشات کا اتباع نہ کرو جو علم نہیں رکھتے...."

سورہ مائدہ کی آیت ۳ میں ارشادِ باری تعالےٰ ہے۔

" آج میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو مکمّل کر دیا اور اپنے انعام کو تم پر پورا کر دیا۔ اور دین ہونے کے اعتبار سے اسلام کو تمہارے لئے پسند کیا۔

مندرجہ بالا آیاتِ مبارکہ کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قانون ساز (شارع) صرف اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذات ہے اور یہ کہ شریعت کو مکمل کر دیا گیا ہے۔ سنتِ رسولِ اکرمؐ چونکہ وحی پر مبنی ہے اس لئے شریعت کا دوسرا بڑا ماخذ رسولِ اکرمؐ ہے۔ قرآن مبین میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ میں (نبی اکرمؐ) اپنی خواہش سے کچھ نہیں بولتا۔ سوائے اس کے کہ جو میری طرف وحی کیا گیا۔ لہٰذا دین یا شریعت قرآن مبین کے حوالہ سے قرآن و سنّت رسولِ اکرمؐ پر ہر طرح سے مکمّل ہو چکی ہے۔ اس میں نہ اضافہ کیا جا سکتا ہے، نہ کمی۔ فقہاء امّت ایک دو نہیں سارے کے سارے ملکر بھی اس میں کوئی اضافہ نہیں کر سکتے۔ فقہاء کی رائے اور ان کے اجتہاد کو انسانی رائے اور اجتہاد سے زیادہ اہمیت دینا منشائے خداوندی کے خلاف ہے۔ میری ناقص رائے میں ایسے احکام کو بدلا بھی جا سکتا ہے اس لئے ان کو اللہ کی کتاب اور سنّت رسولؐ کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔

اب جس امر کی میں نشاندہی کرنا چاہتا ہوں۔ اس کو لیتا ہوں۔ یہ بات ڈھکی چھپی نہیں کہ ہم پچھلے بیالیس سال سے اسلامی نظام کی ترویج کے ضمن میں صرف ایک ہی سمت بڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہ یہ کہ مروّجہ قوانین کس حد تک قرآن و سنت کے منافی ہیں۔ یہی ذمّہ داری مختلف دساتیر کے تحت مقرّر کئے گئے اداروں کو سونپی جاتی ہے اور اب فیڈرل شریعت کورٹ کو بھی کچھ ایسے ہی اختیارات سونپے گئے ہیں۔ میرے نزدیک اسلامی نظام کی ترویج کا یہ نہایت پیچیدہ طریقہ ہے پچھلے ہزار برس سے بلند پایہ فقہاء بھی فقہی اختلافات کو دُور نہ کر پائے۔ ہم قرآن و سنت کو ملکی قانون کا درجہ دیتے تو اسلامی نظام کب کا رائج ہو چکا ہوتا اور فقہی اختلافات بھی ساتھ ساتھ حل ہوتے رہتے۔ آئین میں دی گئی قانون کی تعریف کچھ یوں ہے:-

" آرٹیکل ۲۶۷ (۷) اس آرٹیکل میں "موجودہ قوانین" سے مراد جملہ قوانین (بشمول آرڈیننس، احکام یا اجلاس کونسل، فرامین، قواعد ذیلی قوانین اور ضوابط، کسی عدالتِ عالیہ کو تشکیل کرنیوالے لیٹرز پیٹنٹ اور کوئی اعلان اور قانونی حامل دوسری دستاویزات) ہیں جو یوم آغاز سے عین قبل پاکستان میں یا اس کے کسی حصہ میں نافذالعمل ہوں یا بیرونِ ملک جواز رکھتے ہوں۔

تشریح:۔ اس آرٹیکل میں کسی قانون کے سلسلے میں "نافذالعمل" سے مراد قانون کی حیثیت سے مؤثر ہونا ہے خواہ اس قانون کو روبہ عمل لایا گیا ہو یا نہ لایا گیا ہو۔"

اسی طرح جنرل کلازز ایکٹ کی دفعہ ۳ ــ ۸ ۳۷ کی رُو سے پاکستانی قانون سے مراد کوئی ایکٹ۔ آرڈیننس ریگولیشن۔ رولز۔ آرڈرز یا بائی لاز ہے تو یہ بات مترشح ہے کہ قرآن وسنت کو اب تک پاکستان کا قانون تسلیم ہی نہیں کیا گیا۔ اگرچہ مناسب ترامیم سے ایسا کرنا کسی لمبی چوڑی ریسرچ کا محتاج نہ تھا۔ اگرچہ قرار دادِ مقاصد کو آئین کا حصہ تصور کرنے پر اس ضمن میں عدالتی فیصلوں کی روشنی میں کچھ پیش رفت ہوئی ہے۔ دیکھیں پی۔ایل۔ڈی ۱۹۸۹ء کراچی ۳۰۴۔ ان فیصلہ جات میں قرآن وسنت کو ملکی قانون تصور کیا گیا ہے مگر اب تک اتفاق رائے نہ ہو سکا۔ اس کے باوجود میری ناقص رائے میں مناسب ترامیم سے ہمیں قرآن وسنت کو ملکی قانون تسلیم کرنے میں مزید تاخیر نہیں کرنی چاہیئے۔ اور یہ بات کہ کسی خاص مقدمہ کا فیصلہ کس مسلک کی فقہ کی بنا پر ہوگا عدالتوں کے دائرہ اختیار میں ہی رہے۔ اس بارے میں شریعت ایکٹ ۳۷ کا حوالہ دیا جا سکتا ہے۔ جس کی رُو سے مسلم پرسنل لاء کی تشریح اور توجیہہ کئے بغیر فیصلہ جات کا رول تسلیم کیا گیا۔ تاریخ شاہد ہے کہ عدالتوں نے اس ضمن میں کئی اہم فیصلے دیئے ہیں۔

المختصر ہمیں ہر اس بات سے احتراز کرنا ہوگا۔ جس سے فرقہ واریت کا فتنہ اٹھے اور قومی یکجہتی کو خطرہ ہو۔

تو یہ ہیں چند بنیادی مسائل اگرچہ ان کے علاوہ کچھ اور اختلافی مسائل بھی ہونگے۔ مگر میرے نزدیک مندرجۃ الذکر امور بنیادی حیثیت کے ہیں اور ان سے قومی یگانگت کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ قوم اس کا جتنی جلدی ادراک کرلے اس معاشرہ کے لئے بہتر ہوگا۔

میری دعا ہے کہ خدا ہمیں صراطِ مستقیم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔! آمین

وَاللہ اعلم بالصواب

سلسلۂ معارف القرآن کی اُن کتابوں کے تازہ ایڈیشن جن کا ایک عرصے سے انتظار تھا، چھپ گئے ہیں!

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مدیحہ خان
(ناروے)

تذبذب

میرا نام مدیحہ ہے۔ میرے ماں باپ پاکستان کے رہنے والے ہیں ـــــ میں ناروے میں HAUGERUD سکول کی ساتویں جماعت کی طالبہ ہوں۔ اس طرح میں پاکستانی بھی ہوں اور ناروجن بھی۔ میں نے مسلمانوں کی کہانیاں تو بہت پڑھی ہیں۔ ان کی فتوحات کے معرکے بھی بہت سُن رکھے ہیں۔ لیکن سوچتی ہوں، وہ کہانیوں والے مسلمان آج کیوں دکھائی نہیں دیتے؟ میری ایک سہیلی کہتی ہے، اس کے ابّو پکّے مسلمان ہیں کیونکہ انہوں نے داڑھی رکھی ہوئی ہے۔ میں نے علامہ اقبال اور قائدِ اعظم کی تصویریں دیکھی ہیں انہوں نے تو داڑھی نہیں رکھی تھی۔ کیا وہ مسلمان نہیں تھے؟

ابّو کہتے ہیں ہمارا ایک اللہ ہے ایک رسولؐ ہے۔ ایک کتاب ہے۔ ہم ایک قوم ہیں۔ یہ سارا جہاں ہمارا ہے۔ میرے ابّو جھوٹ تو نہیں بولتے مگر کیا کروں۔ ہم ایسے دکھائی بھی تو نہیں دیتے۔ یہاں اوسلو میں ہم پاکستانیوں نے مذہب اور سیاست کی بنیاد پر کئی گروپ بنا رکھے ہیں۔ یہ سب گروپ ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔ یہ سب مسلمان ہیں لیکن آپس میں ناطہ جوڑنے کی بجائے ناروجنوں کے ساتھ تعلقات قائم کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ اپنے بچّوں کے ساتھ ناروجن زبان میں گفتگو کرتے ہیں۔ یہاں ایسے سکول بھی ہیں جہاں اردو سکھائی جاتی ہے۔ لیکن یہاں پر مقیم بعض والدین اپنے بچّوں کے لئے ایسا سکول تلاش کرتے ہیں جہاں کوئی پاکستانی بچّہ زیرِ تعلیم نہ ہو۔ سمجھ میں نہیں آتا، انہیں اپنے لوگوں سے، اپنی زبان سے اپنی تہذیب سے اس قدر نفرت کیوں ہے؟ گھر میں ہمیں بتایا جاتا ہے کہ دنیا میں دو ہی قومیں آباد ہیں۔ ایک وہ جو مسلمان ہے اور دوسری وہ جو مسلمان نہیں ہے۔ لیکن یہاں غیروں میں ہوں تو پوچھا جاتا ہے آپ پاکستانی ہیں؟ مسلمان ہیں یا ناروجن؟ ـــــ آپس میں ہوں تو سوال اٹھتا ہے۔ آپ شیعہ ہیں یا سنّی اور اگر سنّی ہیں تو حنفی ہیں یا اہلحدیث؟ ـــــ بڑوں کی باتیں سنتے ہیں تو ان میں سے کوئی قومی اتحاد کا نام لیتا ہے اور کوئی پیپلز پارٹی کا۔ کوئی نظریۂ پاکستان کی باتیں کرتا ہے تو کوئی ...

سیکولر نظام کی۔ یہ سب باتیں ہماری سمجھ سے باہر ہیں۔ ہم تو یہ جاننا چاہتے ہیں کہ ہم ہیں کیا؟ کیا ہمارے وطنِ عزیز پاکستان میں بھی یہی ہوتا ہے۔ کیا وہاں بھی مسلمان فرقوں پارٹیوں اور گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں ـــــ کیا وہاں بھی ہر ایک کا اللہ، رسولؐ اور دین الگ الگ ہیں۔ اگر ایسا ہی ہے تو پھر قوم کیا ہے؟ دین کیا ہے؟ مسلمان کسے کہتے ہیں؟ سبھی مسلمان اگر رسولؐ اللہ کے نقشِ قدم پر چلتے ہیں تو ان کے قدم الگ الگ کیوں ہیں؟

یہ وہ سوالات ہیں جو ہمارے ذہنوں میں اُبل رہے ہیں۔ خدارا کچھ تو بتائیں ہم بچے کہاں جائیں؟ کس سے پوچھیں؟ ـــــــ کیا ہم اس تذبذب سے کبھی باہر نہیں آسکیں گے۔ کیا ہمارے مقدر میں صرف ڈانٹ ہی لکھی ہوئی ہے؟

میری سمجھ میں تو آج تک یہ بھی نہیں آیا کہ نماز تو ہم نارویجن سورج کے حساب سے پڑھتے ہیں۔ روزے بھی اسی سورج کو دیکھ کر افطار کرتے ہیں۔ لیکن عید کا چاند کبھی پاکستان میں ڈھونڈتے ہیں اور کبھی سعودی عرب میں۔ کیا نارویجن چاند اس قابل نہیں کہ اس کے مطابق عید منائی جائے۔ میں نے اپنی کتاب میں یہ بھی پڑھا ہے کہ ناروے کے قریب شمال میں سورج کئی کئی دن غروب ہی نہیں ہوتا۔ سوچتی ہوں وہاں کے لوگ نماز روزہ کیسے ادا کرتے ہونگے؟

اور سب سے بڑا مسئلہ جس نے مجھے پریشان کر رکھا ہے۔ یہ ہے کہ ناروے میں مقیم مسلمان لڑکوں کو تو اپنے پاس رکھتے ہیں۔ لیکن لڑکیوں کو الگ کر کے عزیزوں رشتے داروں کے ہاں پاکستان بھیج دیتے ہیں ـــــــ میری عمر تو بہت چھوٹی ہے لیکن میں نے زندہ ماں باپ کی ان یتیم بچیوں کو یہاں سے جاتے ہوئے کبھی خوش نہیں دیکھا۔ خدا جانے پاکستان میں کون سی آب و ہوا ہے جو صرف لڑکیوں کے لئے ہی خوشگوار ہے۔

اُردو زبان میں میرا یہ پہلا مضمون ہے۔ میں نے اس تذبذب کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے جس سے دیارِ غیر میں رہنے والے ہم جیسے ہزاروں بچے دوچار ہیں۔ میری دلی تمنا ہے کہ میرا یہ مضمون پاکستان کے کسی رسالے میں شائع ہو تاکہ میرے بزرگ اپنی قوم کے ان نونہالوں کے اس تذبذب کا کوئی علاج تلاش کر سکیں۔

طباعت اور پیکیجنگ کی جملہ ضروریات کیلئے النور پرنٹرز و پبلیشرز
۲/۳ فیصل نگر ملتان روڈ لاہور
فون 485826

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رابطہ باہمی

۱ بزمِ طلوعِ اسلام پشاور نے :-
- ______ کویت سے احباب کی، بخیریت وطن واپسی پر خوشی کا اظہار کیا ہے۔
- ______ ادارہ کی ہدایت پر، وفاقی شرعی عدالت میں قانونِ وصیت کو چیلنج کرنے پر جناب عبداللہ ثانی صاحب کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔

نوٹ :- درخواست کی باقاعدہ سماعت کیلئے وفاقی شرعی عدالت نے وفاقی حکومت کو نوٹس جاری کر دیا ہے۔ درخواست کی نقل، قارئین کی اطلاع کے لئے اس شمارہ میں شاملِ اشاعت ہے۔

۲ کویت سے وطن واپس آنے والے احباب سے التماس ہے کہ وہ فوری طور پر ادارہ سے رابطہ قائم کریں اور سرِدست اپنے نزدیک ترین بزموں سے وابستہ ہو جائیں۔

۳ جشن عید میلاد النبیؐ کے تسلسل میں بزم طلوعِ اسلام ٹورنٹو (کینیڈا) ۲ دسمبر ۱۹۹۰ء کو مفکرِ قرآن جناب **پرویز صاحبؒ** کے خصوصی درس (بذریعہ وی سی آر) کا اہتمام کر رہی ہے جو سورہ القلم کی ابتدائی سات آیات پر مشتمل ہوگا۔ تقریب INSTITUTE FOR STUDIES IN EDUCATION ONTRIO کے کمرہ نمبر 212-2 میں 3 بجے بعد دوپہر منعقد ہوگی۔ جس میں پرویز صاحبؒ کی کتب کا سٹال بھی لگایا جائے گا۔

تفصیلات کے لئے۔ فون

(1) (416) 626 - 6781 (2) (416) 661 - 2827
(3) (416) 962 - 8025 پر رابطہ قائم کیا جا سکتا ہے۔

تم سے قطعاً نہیں پوچھا جائے گا کہ تمہارے اسلاف نے کیا کیا تھا تم سے یہ پوچھا جائیگا کہ تم نے کیا کیا ($\frac{2}{141}$ $\frac{2}{134}$)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(عبداللہ ثانی ایڈووکیٹ پشاور)

نقل درخواست برائے اصلاح قانونِ وصیّت

بعدالتِ عالیہ فیڈرل شریعت کورٹ اسلام آباد

زیر آئینی اختیار سماعت

بنام فیڈریشن آف پاکستان بذریعہ سیکرٹری قانون و انصاف حکومتِ پاکستان اسلام آباد

درخواست زیر آرٹیکل D - 302 آئین پاکستان 1973 جس کی رُو سے قانونِ وصیّت جیساکہ دفعہ 118 - 117 محمڈن لاء میں درج ہے جس پر عدالتیں عمل درآمد بھی کرتی ہیں۔ جو تعلیماتِ قرآن کریم کے یکسر خلاف ہے اور اس لئے قابلِ تنسیخ اور ناقابلِ عمل ہے۔ مزید یہ قرار پائے کہ وصیّت پر قرآنِ کریم کی رُو سے کوئی پابندی نہیں ہے۔

جنابِ عالی!

سائل حسب ذیل عرض رسان ہے۔

نمبر ۱ ـــــ یہ کہ سائل ایک راسخ العقیدہ مسلم ہے۔ قرآن کریم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بنی نوعِ انسان کے نام آخری پیغام اور سرچشمۂ قوانین و ہدایت سمجھتا ہے لہٰذا احکامِ قرآنی کے مطابق وصیّت کرنا چاہتا ہے۔

نمبر ۲ ـــــ یہ کہ مسلم محمڈن لاء کی دفعات نمبر 118 - 117 کی رُو سے سائل 3/1 حصہ سے زائد وصیّت کرنے سے قاصر ہے۔ چونکہ محمدن لاء کی تدوین ایک غیر مسلم کے ہاتھوں ہوئی ہے۔ اس طرح قرآن مجید کی آیات کو نہ سمجھتے ہوئے غلط طور پر اور غیر اسلامی طور پر پابندی لگا دی گئی ہے جس پر آج بھی عدالتیں عمل درآمد کرتی ہیں۔ مزید برآں غیر وارث کے حق میں 3/1 سے زائد وصیّت نہیں کی جا سکتی۔ جب تک تمام ورثاء اس کی تصدیق نہ کریں اور رضامندی کا اظہار نہ کریں۔

نمبر ۳ ـــــ یہ کہ قرآنِ کریم کی آیت نمبر 2/180 اس سلسلے میں بالکل واضح ہے۔

كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرًا ۚ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَ الْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ۱۸۰

ترجمہ:- فرض کیا گیا تم پر جب تم میں سے کسی کے سامنے موت آکھڑی ہو اور وہ کچھ مال چھوڑے تو انصاف کے ساتھ اپنے ماں باپ اور رشتہ داروں کے لئے وصیت کرے ایسا کرنا متقیوں پر لازم ہے۔

۴/ ــــــ یہ کہ پھر سورہ نساء میں جہاں تقسیم وراثت سے متعلق احکام آئے ہیں۔ وہاں مختلف حصے بیان کرنے کے بعد کہا ہے "مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْ بِهَا اَوْ دَيْنٍ" یہ حصے اس وصیت کو پورا کرنے کے بعد دیئے جائیں جو متوفی نے کی ہو لیکن قرضہ ادا کرنے کے بعد۔ یہ الفاظ تین مرتبہ دہرائے گئے ہیں (۱۱ : ۴)

۵/ ــــــ مزید براں وصیت کا طریقہ کار اور اس کی جزئیات بھی واضح طور پر بتا دی گئی ہیں (۱۰۶ : ۵) چونکہ وصیت فرض کردی گئی ہے لہٰذا مختلف مقامات پر اس کی تفصیل قرآن مجید میں بالصراحت بتادی گئی ہے۔

۶/ ــــــ یہ کسی بھی فرقہ کی فقہ کا نفاذ انسانی قوانین کا نفاذ ہوگا جو قرآن کی نظر میں شرک ہے $\frac{۳۰}{۳۱،۳۲}$ ، $\frac{۶}{۱۶}$)

۷/ یہ کہ درخواست ہذا اس لئے دی جارہی ہے کہ فیصلہ قرآن کریم کے واضح حکم کی روشنی میں صادر فرمایا جائے (۴۷-۴۵-۴۴ / ۵)

۸/ ــــــ یہ کہ سائل کو وصیت کے متعلق قرآن کریم میں درج حکم کا علم ہو گیا ہے اور اب اسے چھپا کر رکھنا خلافِ قرآن سمجھتا ہے جیسا کہ حکم ہے (۱۵۹ : ۲)

۹/ ــــــ یہ کہ مذکورہ بالا آئینِ پاکستان کی رُو سے عدالت حضور کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ کوئی بھی قانون مروجہ جو قرآن یعنی سنت اللہ کے خلاف ہو اس کو کالعدم قرار دیا جا سکتا ہے اور اس طرح مروجہ قانونِ وصیت غیر قرآنی لہٰذا غیر اسلامی ہے۔

لہٰذا استدعا ہے کہ قانونِ وصیت مذکورہ عنوان کو قرآن کریم کے احکامات کے مطابق بنایا جا کر یہ حکم صادر فرمایا جاوے کہ وصیت پر کسی قسم کی قدغن یا پابندی نہیں ہونا چاہیئے۔ مزید براں وارث کے حق میں وصیت نہ ہونے والی شق اور ۳ : ۱ سے زائد وصیت نہ کرسکنے کے قانون کو فی الفور کالعدم قرار دیا جائے اور ساتھ ہی حکومت کو ہدایت کی جائے کہ وہ مطابق قرآن کریم قانونِ وصیت مرتب کرے تاکہ قرآن کریم کی آیات پر عمل درآمد اس لیے کیا جائے کہ یہ فرض ہے۔ (المرقوم ۹۰ : ۵ : ۵)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حقائق عبر

قرار دادِ مقاصد اور ہمارے علماء

دستور ساز اسمبلی نے ۱۲ مارچ ۱۹۴۹ء کو قرار دادِ مقاصد منظور کی جس میں کہا گیا تھا کہ پاکستان کا نظامِ حکومت اسلامی تعلیمات کے مطابق قائم کیا جائے گا۔ اسی قرار داد کے حوالے سے ہمارے علماء پچھلے چالیس سال سے اسلامی نظام کے نعرے لگا رہے ہیں۔ قرار داد کی اصل حقیقت ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے بھائی جناب اقتدار احمد صاحب کے الفاظ میں سنئے وہ فرماتے ہیں :-

" قیامِ پاکستان کو روکنے کی کوشش میں ناکام ہونے کے بعد اب علماء نے ملک پر قبضہ کرنے کی ٹھان لی جو اُن کے خیال میں اسلام کے بغیر زندہ نہ رہ سکتا تھا۔ اسلام بھی وہ جو "مستند" ہو۔

علمائے دین دعوائے قیادت کے ساتھ خم ٹھونک کر میدان میں آ گئے اور حکومتی مناصب میں اپنا حصہ طلب کیا۔ درحقیقت انہوں نے وزارتِ مذہبی امور کی ایک تجویز اور اس میں مناصب کی تفصیل قائدِ اعظم کی زندگی میں ہی پیش کر دی تھی جسے انہوں نے لائقِ توجہ نہ سمجھا۔ تاہم ان کے جانشین علماء کے اس نوع کے مطالبے نظر انداز کرنے کی ہمت اور حیثیت نہ رکھتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ جدت پسند مسلمانوں اور علماء میں مسلسل کشاکش نے ایک متعین شکل اختیار کر لی۔ قرار دادِ مقاصد میں جو علماء کو خوش کرنے کے لئے تیار کی گئی، عوام کے اس عزم کا اظہار تھا کہ " ایک آزاد خود مختار ریاست پاکستان "، کے لئے آئین سازی کی جائے۔ ریاست اور اللہ تعالیٰ کو بیک وقت "مقتدرِ اعلیٰ" قرار دیا گیا۔ دستور ساز اسمبلی نے جسے دستور "سازی" کرنا تھی، علماء کے اس دعوے کو مسترد کر دیا کہ خدائی قانون تو بنا بنایا موجود ہے چنانچہ کسی قانون "سازی" کی ضرورت نہیں جیسا کہ قرار دادِ مقاصد کا منشاء ہے بلکہ پیشِ نظر کام صرف پہلے سے موجود قانون کا نفاذ ہونا چاہیئے۔

(ہفت روزہ ندا، بابت ستمبر ۱۹۹۰ء صـ۱۱)

عورت کی حکمرانی

محترمہ بے نظیر بھٹو صاحبہ نے بطور وزیرِ اعظم حلف اٹھایا تو اہلِ حدیث کے علماء نے ایک ضعیف حدیث کا سہارا لے کر، ان کی حکومت کو اہلِ پاکستان کے لئے عذاب الٰہی قرار دے دیا۔ بے نظیر صاحبہ کی حکومت ختم ہوئی، تو اقتدار اسلامی جمہوری اتحاد کے حوالے کر دیا گیا، جن میں فرقہ اہلِ حدیث بھی شامل ہے۔ اسلامی جمہوری اتحاد والوں نے ایک چھوڑ دو خواتین کو وزیر بنا دیا۔ اس بارے میں فرقہ اہل حدیث کا ایک فرد، اپنے فرقہ کے علماء سے یہ سوال کرتا ہے۔

"عورت کی سربراہی سے متعلق اسلام اپنا دو ٹوک فیصلہ دیتا ہے کہ یہ منع ہے۔ اسلامی اتحاد والوں نے الیکشن مہم میں اس حدیث کو استعمال کیا لیکن خود اس اتحاد نے خواتین کو پارٹی ٹکٹ دیئے اور بعض خواتین کو قلمدانِ وزارت دے کر بعض محکموں کا سربراہ بنا دیا اور اب بھی بنایا ہے کیا یہ محکمے عورت کی سربراہی میں پھل پھول سکتے ہیں۔ آخر یہ دوغلی پالیسی کیوں۔ آخر ایسا کیوں ہے کہ اتحاد سے باہر کوئی عورت الیکشن لڑتی ہے تو اسلام کی رُو سے اسے نااہل قرار دے دیا جائے جب گھر کی عورت وہی کچھ کرے تو اس کے اس اقدام کو ناجائز قرار دیا جائے۔ کیوں؟"

(ہفت روزہ تنظیم اہلحدیث لاہور بابت ستمبر ۱۹۹۰ء صـ۲)

فرقہ اہل حدیث کے اس ترجمان نے اپنے قاری کا یہ سوال تو شائع کر دیا ہے۔ لیکن اس اعتراض کا جواب کوئی نہیں دیا۔ جب دینِ اسلام کو سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کیا جانے لگے تو پھر اس قسم کے اعتراضات کا جواب دیا بھی کیا جا سکتا ہے۔

شیطانی دھوکا

فرقہ اہل حدیث کا ایک ترجمان ہفت روزہ تنظیم اہل حدیث اس عنوان کے تحت لکھتا ہے:۔

"برادرانِ اسلام! قیامِ پاکستان سے پہلے عموماً اور بعد میں خصوصاً لوگوں نے حضرت علی ہجویری رح (پیدائش ۴۰۰ھ اور وفات ۴۶۵ھ) کو داتا کے نام سے مشہور کر دیا ہے کہ آج سب لوگوں کی زبان پر جلسوں، مسجدوں، دیواروں اور اشتہاروں پر یہ نام لکھا ہوا ملتا ہے اور جاہل لوگ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ یہ بزرگ ہماری سب حاجتیں پوری کرتے ہیں۔ اس شرکیہ عقیدے نے یہاں تک ترقی کر لی ہے کہ جب ہر سال کے بعد علی ہجویریؒ کا عرس ہوتا ہے تو ہزاروں من دودھ عرس

پر جاتا ہے۔ شہر لاہور اور اس کے گرد و نواح میں غریب لوگوں، بچوں، بیماروں کو دودھ ملنا بے حد مشکل ہو جاتا ہے۔ ہر حکومت اور بدعتی علماء اپنی شہرت کی خاطر زیادہ سے زیادہ عرس کی تشہیر کرتے ہیں۔ عوام کی جہالت اس شرکیہ عقیدہ میں غرق ہے۔ مشرک پیروں اور مولویوں کا خصوصی طبقہ اس قبر پرستی کی سرپرستی کر رہا ہے اور کم علم رسمی مسلمانوں میں یہ بھی مشہور ہے کہ پاکستان کو صرف بزرگوں اور ولیوں نے بچایا ہوا ہے، ورنہ اب تک یہ ختم ہو گیا ہوتا اور پھر لاہور شہر کو داتا کی نگری کہتے ہیں اور یہ بھی مشہور کر رکھا ہے کہ لاہور شہر کی تو المعروف داتا صاحب نے حفاظت کر رکھی ہے اسی وجہ سے ان کی قبر پہ دن رات شرک ہو رہا ہے

حضرت علی ہجویری رح کے مزار کی لاہور میں وہی حیثیت ہے جو کہ مکہ معظمہ میں ہبل کی تھی۔ مکہ میں مشرکین مکہ کا سب سے بڑا داتا ہبل بت تھا۔ اب دلائل قویہ کی روشنی میں ثابت کیا جاتا ہے کہ لفظ داتا جس مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ اللہ کے علاوہ کسی غیر پر اس کا اطلاق ہرگز جائز نہیں کیونکہ قاضی الحاجات اور دافع بلیات صرف اللہ ہی ہے۔

(ہفت روزہ تنظیم اہلحدیث لاہور بابت ۲۱ ستمبر ۱۹۹۰ء)

اس مضمون کے شائع ہونے کے تین چار دن بعد اسلامی جمہوری اتحاد نے اپنی انتخابی مہم کا آغاز داتا دربار پر چادر چڑھا کر کیا۔ اخباری خبر کے مطابق، اس تقریب میں اسلامی جمہوری اتحاد کی تمام جماعتوں کے نمائندے شامل تھے فرقہ اہل حدیث کی اس تقریب میں شامل نہ ہونے کی کوئی وضاحت ابھی تک اخبارات میں شائع نہیں ہوئی لہٰذا ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں، اس تضاد ہی نے تو علماء حضرات کی باتوں کو بے وقعت بنا دیا ہے۔

قائدِ اعظم رح اور علماء

ہفتہ روزہ اہلحدیث ۲۱ ستمبر ۱۹۹۰ء کے اداریہ کی چند سطور ملاحظہ ہوں۔

"پاکستان بنانے میں جناب محمد علی جناح مرحوم کے زیر سایہ لیگ نے جو محنت کی وہ قابل رشک ہے جس کی وجہ سے لیگ کا ماضی مثالی ہے مگر بعد میں آنے والے مجاور کچھ بہتر کام کئے بغیر اس موڈ میں رہنے لگے ہیں کہ انکی تعریف کی جائے۔"

پوری قوم قائدِ اعظم رح کو اپنا محسن سمجھتی ہے اور ادب و احترام سے ان کا نام لیتی ہے لیکن علماء حضرات کے دل میں چھپا ہوا بغض ملاحظہ ہو کہ وہ جیسا کہ مندرجہ بالا تحریر سے ظاہر ہے، انہیں قائدِ اعظم رح کہنے کیلئے اب بھی تیار نہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقد و نظر

- نام کتابچہ ——— غلامی کے افکار
- مصنّف ——— حافظ محمد یعقوب خان تاجیک
- کتابت ——— بقلم مصنّف
- ملنے کا پتہ ——— ۲-اے / ۳-اے
انگوری باغ، ہاؤسنگ اسکیم
شالامار ——— لاہور
- قیمت ——— درج نہیں

۴۸ صفحات پر مشتمل یہ کتابچہ سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کی تفسیر تفہیم القرآن کے غیر حقیقی معیار کا محققانہ جائزہ ہے۔ کتاب کا مقصد انتساب سے ظاہر ہے جو کتاب کے صفحہ ۴ پر ان الفاظ میں درج ہے۔

"ان نوجوانوں کے نام جن کی نگاہ قرآن پہ ہے اور جو حفاظتِ ذات میں یہ نہیں بھولے کہ بنی نوعِ انسان کے مشترکہ تحفظ میں انسانوں کی غلامی ایک غیر فطری، ایک غیر حقیقی ایک غیر مہذب اور ایک ناجائز عمل ہے۔"

القرآن

جب تک کسی بات کی خود تحقیق نہ کر لو اس کے پیچھے مت لگو　(۱۷ : ۳۶)

قرآنی تعلیم: بچوں کے لئے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قاسم نوری

مُنافق

السّلام علیکم بچّو! "مسلم" اور "مومن" کا مفہوم سمجھ لینے کے بعد بہت ضروری ہے کہ آپ "منافق" کا مفہوم بھی سمجھ لیں۔ یہ ایک مشکل سا لفظ ضرور ہے اور ہمیں معلوم ہے کہ اس لفظ کو یاد کرنے اور ادا کرنے میں بچّوں کو دِقّت بھی ہوگی لیکن ہمیں یہ بھی پتہ ہے کہ مُسلم بچّے مشکل کام اور مشکل بات سے گھبراتے نہیں بلکہ چیلنج سمجھ کر قبول کرتے ہیں۔ تو بچّو ذرا توجہ سے پڑھو اور سمجھو گے تو یہ لفظ بھی آسان ہو جائے گا۔

اچھا بچّو! گزشتہ مضمون میں ہم نے دہرایا تھا کہ "مسلم" وہ ہوتا ہے کہ جب اس کے سامنے حق پیش کیا جائے تو وہ عقل کی رُو سے پہلے اس پر خوب غور کرتا ہے اور پھر دل سے اسے تسلیم کرلیتا ہے لیکن تسلیم کرلینے کے بعد بھی بہت سے مسلم اس پر عمل نہیں کر پاتے۔ کہلاتے پھر بھی وہ مسلم ہی ہیں لیکن بچّو! مومن وہ ہوتا ہے جو حق کو تسلیم کرلینے کے بعد صرف زبان سے ہی اقرار نہیں کرتا بلکہ عمل بھی کرتا ہے اور اس طرح عمل کرتا ہے کہ حق اس میں اور وہ حق میں ڈھل کر ایک ہو جاتے ہیں۔

اس کے بعد قرآن نے ایک تیسری قسم بتائی ہے۔ منافق لوگوں

کی قسم۔ اور آج ہم آپ کو بھی اسی کا مفہوم سمجھائیں گے۔

پیارے بچّو! عربی زبان میں ایک لفظ ہے "نفق" یہ ایسی سُرنگ، سوراخ یا راستے کو کہتے ہیں جو دونوں طرف سے کھُلا ہُوا ہو۔ اور ایک طرف سے داخل ہو کر دوسری طرف سے نکل جانے والے کو "نافق" کہتے ہیں۔ اس اعتبار سے منافق کا مطلب ہُوا ایسا شخص جو فرار ہونے کے لئے دوسرا راستہ بھی تیّار رکھے۔ یعنی ایسا دُورنگا، دوغلا، اور ڈھل مل یقین شخص جسے خود اپنی بات کا بھی یقین نہ ہو جو کسی مطلب یا مجبوری کی وجہ سے حق کو تسلیم بھی کرے، اقرار بھی کرے اور ایسی صورت یا راستہ بھی تیّار رکھے کہ جب چاہے نکل جائے، پینترا بدل جائے

دیکھو بھئی! اللہ تعالےٰ نے تو کسی بھی (جاندار) کے سینے میں دو دِل نہیں رکھے۔ ($\frac{33}{4}$)۔ لہٰذا قرآن کریم کے مطابق "منافق" وہ ہُوا جس کی زبان پر تو کچھ اور ہوتا ہے لیکن دِل میں کچھ اور ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں سے بچنے پر بہت زور دیا ہے۔ اس کی اہمیّت کا اندازہ اس سے لگاؤ کہ منافقوں کے بارے میں قرآن کریم کے اندر پُوری اور مکمّل سُورت موجود ہے جس کا نام ہی سورہ منافقون ہے ۔ یہی نہیں یہ لفظ قرآن کریم میں 28 مقامات پر آیا اور استعمال ہُوا ہے اور ایک سو آیتوں میں منافقین کا ذکر کر کے اللہ نے ہمیں ان سے ہوشیار اور خبردار رہنے کی تاکید کی ہے۔ اور اس کی زبردست اہمیّت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم کا آغاز ہی ان کے ذکر سے کرتا

ہے۔ سورۂ بقرہ کی ابتدا میں ہی تین جماعتوں اور گروہوں کا ذکر ہے۔

اوّل:۔ جو حق پر ایمان لاتے ہیں۔ اس پر عمل کرتے ہیں اور حق کا ساتھ دیتے ہیں۔

دوم:۔ جو حق کو تسلیم ہی نہیں کرتے اور اور کھلے طور پر صاف صاف انکار کرتے ہیں۔

سوم:۔ جو حق کو تسلیم زبان سے تو کرتے ہیں۔ دل سے نہیں کرتے۔ بلکہ دل میں مخالف ہوتے ہیں۔

تو یہ ترتیب اس طرح بنی کہ اوّل ہوئے 'مسلم' اور 'مومن' دوسرے ہوئے 'کافر' اور تیسرے کہلائے "منافق"۔

عزیز بچو! اللہ تعالیٰ نے منافقین کو بدترین مخلوق کہہ کر پکارا ہے۔ کیونکہ بچو! کھلے ہوئے دشمن سے تو آپ محتاط رہ سکتے ہیں نا، لیکن جو شخص ظاہر میں آپ کا دوست ہو، آپ سے محبت کر رہا ہو۔ آپ کے دکھ سکھ میں شامل ہو۔ اس کے متعلق کیسے سوچا جا سکتا ہے کہ وہ نقصان بھی پہنچا سکتا ہے، دھوکہ بھی دے سکتا ہے، تباہی کا سبب بھی بن سکتا ہے۔

• منافق' فاسق ہوتا ہے (9/67) فاسق بھی اور کافر بھی (9/80 = 9/53) یہ جہنم میں جائیں گے (32/20 = 46/20) —— یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کیسے معلوم ہو کہ منافق کون ہے اور کون نہیں ہے؟ تو بھئی اللہ نے ان کے نام تو نہیں بتائے۔ البتہ پہچان ضرور بتا دی ہے اور کہا ہے کہ تم ان کے طرزِ کلام (اور طرزِ عمل) سے پہچان سکتے ہو (47/30) —— اب ہم قرآن کی رُو سے منافقین کی پہچان آپ کو بھی بتا دیتے ہیں اور آپ بچے تو بہت ہی ذہین اور عقلمند ہوتے ہیں

فوراً پہچان جائیں گے اور ایکدم پہچان جائیں گے ___ تو منافق ہوتے ہیں۔
•۔جھوٹی قسمیں کھانے والے ___ $(\frac{58}{14})$
•۔شریف اور نیک لڑکیوں کو چھیڑنے والے $(\frac{33}{59-60})$ •۔ جس بات سے روکو وہی کریں گے۔سلام تک ذو معنی الفاظ میں کریں گے $(\frac{58}{8})$ •۔کسی کی مدد کر کے احسان جتانے والے $(\frac{9}{54} = \frac{2}{263})$
•۔زبان سے کچھ کہیں اور دل میں کچھ اور ہو $(\frac{3}{196})$ • لوگوں کو دکھانے کی خاطر اچھے کام کرنے والے $(\frac{2}{264})(\frac{4}{38})$ • کسی بات کو سنجیدگی سے سمجھنے کے بجائے اس پر جھٹ سے اعتراض کرنے والے $(\frac{74}{34})$ • ہر بات میں شک اور شبہ کرنے والے $(\frac{24}{50})$ •۔ انہیں کسی بات پر اعتماد نہیں ہوتا $(\frac{33}{12})$ دل میں بغض اور حسد پیدا ہوتا ہے $(\frac{8}{49})$

• ذہن ایسا مکدر ہوتا ہے کہ کوئی بات صاف صاف معلوم نہیں ہوتی $(\frac{9}{125})$
• زبان سے کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور آخرت پر ایمان لائے لیکن (دل سے) وہ مومن نہیں ہوتے ۔ یہ لوگ اللہ اور مومنوں کو دھوکہ دیتے ہیں۔لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو دھوکا دیتے ہیں $(\frac{2}{8-9})$

پیارے بچو! انگریزی زبان میں منافق کے لئے چار لفظ ہی زیادہ استعمال کئے گئے ہیں۔یہ چار لفظ ذرا مشکل ہیں لہٰذا ہم انہیں بولنے کا طریقہ یعنی تلفّظ اور ادائیگی ___ ان کے نام اور معانی بھی بتا دیتے ہیں تاکہ آپ ان کو اچھی طرح سے بول اور سمجھ بھی سکیں پہلا لفظ ہے، HYPOCRITE۔یہی لفظ زیادہ تر استعمال کیا جاتا ہے آپ اس کا تلفّظ

یوں ادا کریں (ہی پوک رِٹ) HI-POK RITE — منافقت یعنی منافقانہ عمل کے لئے آپ کہیں گے ہی۔پوک۔ری سی لکھیں گے (HI-POK-RI-SI اس طرح (HYPOCRICY) دوسرا لفظ ہے۔ ڈس۔سمب۔لر (DISSE MBLER)۔ اس کا تلفظ یوں ہوگا (DI-SEMB-LER) تیسرا لفظ ہے۔ پری ٹینڈر (PRETENDER) یعنی جھوٹا دعوےٰ کرنے والا۔ چوتھا لفظ ہے ڈس۔اِن۔جینو۔اس (DIS-IN GENUOUS)۔ اس کا تلفظ ہوگا، (DIS-IN-GEN-U-OUS) معنی ہونگے دوغلا، دورنگا، دو رُخا ظاہردار، زمانہ ساز اور فریبی۔

بچّو! ہمیں اس بات پر ضرور غور کرنا چاہیئے کہ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ ہم بھی کہتے کچھ اور ہیں اور کرتے کچھ اور ہیں۔ اور اگر ایسا ہے تو آج ہی ہمیں اسے چھوڑ کر سچّا اور پکّا مومن بن جانا چاہیئے۔

مردِ قلندر

جونہی آپ طلوعِ اسلام کا نام لیتے ہیں تو بلا توقف ایک ایسی عظیم شخصیّت آپ کے سامنے آجاتی ہے کہ جس کے بغیر طلوعِ اسلام کی فکر بے عنوان رہ جاتی ہے — یہ شخصیّت وہ مردِ قلندر ہے کہ

ندارد عشق سامانے و لیکن تیشۂ دارد خراشد سینۂ کہسار و پاک از خونِ پرویز است

خدا کرے اس مردِ کوہکن کا پیامِ انقلاب دنیائے انسانیت کے لئے وہی تخمِ صالح بن جائے جس سے ایک مرتبہ پہلے سرزمینِ حجاز میں وہ شجرِ بلند و بالا ہوچکا ہے جس کی رفعتوں کے متعلق اَصۡلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرۡعُهَا فِی السَّمَآءِ (۱۴/۲۴) کہا گیا تھا اور جس کی ہمہ گیر پہنائیوں کو لَّا شَرۡقِيَّةٍ وَّلَا غَرۡبِيَّةٍ (۲۴/۳۵) سے تعبیر کیا گیا تھا۔ اس شجرِ طیّب کی روئیدگی اور بارآوری آبِ رودِ قرآن ہی سے ممکن ہے اور یہی ہمارے محترم جناب پرویزؒ کے پیام کا مقصود و منطوق ہے —

طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) کی

اکتوبر مطبوعات کی قیمتیں سنہ ۱۹۹۰ء

نوٹ: اِن قیمتوں میں ڈاک اور پیکنگ کا خرچ شامل نہیں

نام کتاب	قیمت
مفہومُ القرآن (مکمل سیٹ۔ کھلے پارے)	۱۵۰/۰۰ روپے
پارہ نمبر ۱، ۳۰ (فی پارہ)	۶/۰۰ "
پارہ نمبر ۲ تا ۲۹ (فی پارہ)	۵/۰۰ "
مفہومُ القرآن (مکمل سیٹ۔ مجلد)	۱۷۰/۰۰ "
(تین جلدوں میں۔ فی جلد)	۶۰/۰۰ "
لُغات القرآن۔ (مکمل سیٹ۔ مجلد۔ ایک جلد میں)	۲۸۵/۰۰ "
چار جلدوں میں (فی جلد -/۷۵)	۳۰۰/۰۰ "
تبویبُ القرآن۔ تازہ ایڈیشن (تین جلدوں میں)	۲۵۰/۰۰ "
ایک جلد میں	۲۴۰/۰۰ "
مطالبُ الفرقان ۔ چھ جلدیں	۴۶۵/۰۰ "
(جلد اوّل، دوم۔ تازہ ایڈیشن۔ جلد سوم) ہر جلد	۷۵/۰۰ "
مطالبُ الفرقان ۔ جلد چہارم	۹۰/۰۰ "
مطالبُ الفرقان۔ جلد پنجم و ششم (ہر جلد)	۷۵/۰۰ "
من و یزداں (تازہ ایڈیشن)	۷۵/۰۰ "
ابلیس و آدم (تازہ ایڈیشن)	۷۵/۰۰ "
جُوئے نُور (تازہ ایڈیشن)	۶۰/۰۰ "

نام کتاب		قیمت
برقِ طُور	(تازہ ایڈیشن)	۶۰/۰۰ روپے
شُعلۂ مستُور	(تازہ ایڈیشن)	۶۰/۰۰ "
معراجِ انسانیت	(تازہ ایڈیشن)	۶۰/۰۰ "
مذاہبِ عالم کی آسمانی کتابیں	(اعلیٰ ایڈیشن)	۵۰/۰۰ "
	(سٹوڈنٹ ایڈیشن)	۲۰/۰۰ "
اِنسان نے کیا سوچا؟	(تازہ ایڈیشن)	۷۵/۰۰ "
اِسلام کیا ہے؟	(تازہ ایڈیشن)	۵۰/۰۰ "
کتابُ التقدیر	(تازہ ایڈیشن)	۵۰/۰۰ "
جہانِ فردا		۴۵/۰۰ "
شاہکارِ رسالتؐ	(تازہ ایڈیشن)	۷۵/۰۰ "
نظامِ ربوبیت	(اعلیٰ ایڈیشن)	۱۲۰/۰۰ "
	(سٹوڈنٹ ایڈیشن)	۴۰/۰۰ "
تصوف کی حقیقت		۶۰/۰۰ "
قرآنی قوانین	(ڈیلکس ایڈیشن)	۵۰/۰۰ "
	(سٹوڈنٹ ایڈیشن)	۱۰/۰۰ "
سلیم کے نام خطوط	(مکمل سیٹ)	۸۵/۰۰ "
(جلد اوّل ۴۰ روپے، دوم -/۲۰ روپے جلد سوم ۲۵/۰۰ ")		

نام کتاب	قیمت
طاہرہ کے نام خطوط (ڈیلکس ایڈیشن)	۶۰/۰۰ روپے
(سٹوڈنٹ ایڈیشن)	۱۲/۰۰ "
اسلامی معاشرت	
مقامِ حدیث (تازہ ایڈیشن)	۱۰/۰۰ "
قرآنی فیصلے جلد اوّل (سابقہ اوّل، دوم، سوم)	۶۰/۰۰ "
جلد چہارم، پنجم (فی جلد)	۱۳/۰۰ "
ختمِ نبوتؐ اور تحریکِ احمدیت	۴۵/۰۰ "
حُسنِ کردار کا نقشِ تابندہ (تازہ ایڈیشن)	۱۲/۰۰ "
تحریکِ پاکستان اور پرویزؒ (ڈیلکس ایڈیشن)	۲۵۰/۰۰ "
(سٹوڈنٹ ایڈیشن)	۷۰/۰۰ "
نوادرات۔ مجلّد	۷۵/۰۰ "
پیپر بیک	۶۰/۰۰ "
اسبابِ زوالِ اُمّت	۳/۰۰ "
قتلِ مرتد اور غلام اور لونڈیاں اور یتیم پوتے کی وراثت	۸/۰۰ "
اقبالؒ اور قرآن۔ جلد اوّل (ڈیلکس ایڈیشن)	۴۵/۰۰ "
جلد دوم (ڈیلکس ایڈیشن)	۷۰/۰۰ "
پرنسپلز آف لا میکنگ اِن اِسلام (انگریزی)	۶/۰۰ "
ISLAM A CHALLENGE TO RELIGION DELUXE	100/- "
STUDENT	35/- "
EXPOSITION OF The Holy QURAN	Rs.200/-
ISLAMIC WAY OF LIVING	25/- "

نام کتاب	قیمت
مطبوعات النور پرنٹرز	
قبلۂ اوّل	۴۵/۰۰ روپے
لِسان القرآن	۳۵/۰۰ "
وطن کی مٹی گواہ رہنا	۵۰/۰۰ "
تحریکِ پاکستان گولڈ میڈل	۱۲۰/۰۰ "
عزیز بھٹی شہید، نشانِ حیدر	۱۵۰/۰۰ "
تاریخ پنجاب اور افاغنہ قصور کا کردار	۱۴۰/۰۰ "
معجم المفہرس (سٹوڈنٹ ایڈیشن)	۲۰۰/۰۰ "
(اعلےٰ ")	۴۰۰/۰۰ "
پاکستان کے انکم ٹیکس قانون کی تفصیلات سٹوڈنٹ	۲۰۰/۰۰ "
PRACTICAL HAND BOOK OF INCOME TAX PROFESSIONAL EDITION	۵۰۰/۰۰ "
تصنیفات ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب	
PHENOMENA OF NATURE & QURAN	64/- "
THE HEAVENS, THE EARTH & THE QURAN	64/- "
QURANOCRACY NOT DEMOCRACY	Rs.50/-
FOOD AND HYGIENE IN ISLAM	9/- "
GATEWAY TO THE QURAN	54/- "
CONSPIRACIES AGAINST THE QURAN	———
مظاہرِ فطرت اور قرآن	۱۳۲/۰۰ "

کتابیں ملنے کے پتے: **طلوعِ اسلام ٹرسٹ** (رجسٹرڈ) ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور ۱۱، پاکستان۔ فون ۸۷۹۲۴۶ ✻ **مکتبہ دین و دانش** چوک اردو بازار، لاہور، پاکستان

1990. It presents in full details the achievements of the Muslims of the Sub-continent under the banner of the Quaid-i-Azam Muhammad Ali Jinnah.

One unique feature of this book is the mention of launching the Monthly Tolu-e-Islam and the role of Allama Ghulam Ahmed Parwez during the Pakistan Movement which the writers and historians in Pakistan have generally refrained from.

It is hoped that the study of this book which is one of a series of books being published in Pakistan during 1990 to commemorate the historic 1940 Lahore Resolution of the All India Muslim League (later called the Pakistan Resolution), will help in removing the confusion created by the *Ulema* and other opponents about the achievements of the Pakistan Movement and in this way it will foil their attempt to distort the history of Pakistan.

DEAR READERS !

SHOULD YOU BE PLEASED TO PERPETUATE THE VOICE FOR ESTABLISHMENT OF QURANIC SOCIAL ORDER, PLEASE PAY FOR THE MAGAZINE TOLU-E-ISLAM AND PERSUADE OTHERS TO FOLLOW YOU.

PLEASE KEEP YOUR SUBSCRIPTION RENEWED TO DATE BY REMITTING THROUGH MONEY ORDER OR CHEQUE A SUM OF RS. 60 EVERY YEAR.

THE COMPUTER HAS INSTRUCTIONS TO STOP DESPATCH IF SUBSCRIPTION IS NOT PAID UNTIL TWO MONTHS AFTER EXPIRY OF THE DATE NOTED ON TOP RIGHT CORNOR OF YOUR WRAPER.

DESPATCH BY VP SHALL ONLY BE MADE UPON REQUEST AS IT COST Rs. THIRTEEN EXTRA,.

THOSE RECEIVING MAGAZINE FREE OF COST MAY ALSO REMIT RS.60 IF THEY FEEL INCLINED TO SHARE THE BURDON ON THOSE BEARING THE COST OF MAGAZINE.

BOOK REVIEW

GOLDEN JUBILEE OF THE PAKISTAN RESOLUTION

Author: Professor Rafi Ullah Shehab.

Publishers: An-noor Printers & Publishers
P.O.Box 4190 Lahore

Pages 240 : Price Rs. 120.00

The All India Muslim League passed the Pakistan Resolution on March 23, 1940, and in this way provided a guideline for the Muslims of the Sub-continent for establishing their independent Islamic State – Pakistan. They gathered under the banner of the Quaid-i-Azam Muhammad Ali Jinnah and started their struggle for the achievement of their objective. Unfortunately the *Nationalist Ulema* and the religio-political leaders opposed the establishment of Pakistan. No doubt, in the beginning, their opposition had negative effects on the masses but eventually the nation rejected these henchmen of the Hindu dominated Indian National Congress and Pakistan became a reality.

More than forty three years have passed when we achieved independence from the foreign yoke but it is unfortunate that so far no authentic history of Pakistan has been compiled. As a result the new generation is unaware of the negative role played by these *Ulema* to hinder the establishment of Pakistan. Taking advantage of this state of affairs, the followers of such *Ulema* have tried to distort the history of Pakistan Movement. As a first step, they confused the new generation about the genesis of Pakistan and then made a funny claim that these very *Ulema* who had opposed the establishment of Pakistan, were actually the founding fathers of this Islamic State. This state of affairs demanded that the details of the activities of the leaders who led the Pakistan Movement should be presented before the new generation so that it may have a clear idea of the genesis of Pakistan. As a part of this attempt, the book under review has been compiled by Professor Rafi Ullah Shehab, the famous research scholar of Pakistan. His research work has been recognized even outside the country.

The book consis-ts of 32 chapters starting from the spread of Islam in the Sub-continent to the dismissal of the democratic government on August 6,